مولانا محمود احمد عباسی

کی کتاب

خلافت معاویہ و یزید

پر

تبصرہ

★

نیاز فتحپوری

مولانا محمود احمد عباسی کی کتاب

خلافتِ معاویہ ویزید

پر

مولانا نیاز فتحپوری کا عالمانہ و بے لاگ

تبصرہ

قیمت ——————— ۵۰ پیسے

ناشر:- ادارۂ نگار پاکستان
۳۲- گارڈن مارکیٹ- کراچی ۳

(جملہ حقوق محفوظ)

تعداد طبع .... ایک ہزار
ایڈیشن .... چوتھا
تاریخ اشاعت .... اپریل سنہ ۱۹۶۵ء
کتابت .... عبدالمقتدر خوشنویس
ناشر .... عارف نیازی

یکے از مطبوعات
نگار پاکستان۔ کراچی ۵

طابع۔ مشہور آفسٹ پریس۔ کراچی

امیر معاویہ و یزید

تبصرہ

مولانا محمود احمد عباسی کی تازہ تصنیف خلافتِ معاویہ و یزید، جو حال ہی میں کراچی سے شائع ہوئی ہے یقیناً بڑا زبردست چیلنج ہے نہ صرف اہل تشیع کو بلکہ اکثر اہل تسنن کو بھی جو معاویہ و یزید اور حسین کے باب میں کچھ اور رائے رکھتے ہیں۔

یزید کو اتنے زمانے سے برا سمجھا جا رہا ہے کہ اس کی برائی گویا حقیقت ثابتہ ہو کر رہ گئی ہے اور اس کو مستحق لعنت سمجھنا اس حد تک ہمارے ذہنوں میں رچ بس گیا ہے کہ اس کے خلاف کوئی بات سننا ہم مشکل ہی سے گوارا کر سکتے ہیں۔

یزید کے بارے میں یہ گفتگو کہ وہ قابلِ لعنت ہے یا نہیں۔ کوئی نئی چیز نہیں۔ اب سے صدیوں پہلے فقہا۔ اصول فقہ کی کتابوں میں اس مسئلہ پر گفتگو کر چکے ہیں اور اس باب میں اہل تسنن کا مسلک یہ ہے کہ "لا یجوز اللعنۃ علی یزید" (یزید پر لعنت جائز نہیں) لیکن اس عدم جواز کا تعلق صرف اس فقہی نظریہ سے ہے کہ اگر وہ واقعی ان تمام معاصی کا مرتکب ہوا جو اس سے منسوب کئے جاتے ہیں تو بھی ہمیں لعنت بھیجنے کا کوئی حق حاصل اس پر نہیں کیونکہ ایک خاطی و گنہگار مسلمان کی مغفرت خدا کی مرضی پر منحصر ہے

اور ہم اس کے ناجی یا غیر ناجی ہونے پر کوئی رائے قائم نہیں کر سکتے ــــ گو اس سلسلے میں یہ منطقی لطیفہ پیش کیا جا سکتا ہے کہ اگر یزید کو خدا بخش سکتا ہے تو اس پر لعنت بھیجنے والوں کو بھی بخش سکتا ہے اگر اس پر لعن کرنا واقعی کوئی گناہ ہے۔

شیعوں کا مسلک اس باب میں بالکل مختلف ہے اور چونکہ ان کا مذہب آلِ فاطمہ (آلِ علی نہیں) کے دائرہ میں محدود ہو کر رہ گیا ہے، اس لئے اس کی جذباتی نزاکت مشکل ہی سے کسی ٹھیس کو برداشت کر سکتی ہے۔ اس لئے یہ یقین کر لینے کے بعد کہ قاتلِ حسین یزید ہی تھا، وہ اس کے مسلمان ہونے ہی سے انکار کر سکتے ہیں۔ اس کی مغفرت یا اس کو برا نہ کہنے کا کیا سوال؟

اسی طرح دوسرا مسئلہ یزید کے خلاف خروجِ حسین کا ہے کہ شیعی جماعت تو بلا اختلاف اسے نہ صرف جائز و مستحسن بلکہ لازم و ضروری خیال کرتی ہے لیکن اہلِ سنن میں بعض حضرات ایسے بھی ہیں جو حسین کے اس خروج کو جائز قرار نہیں دیتے اور انھیں میں سے اس کتاب کے مولف مولانا محمود احمد عباسی ہیں۔

ان کا کہنا یہ ہے کہ جمہور نے یزید کے حق میں بیعت کر لی تھی۔ اس لئے حسین کا خروج، گویا خلیفۂ وقت کے خلاف خروج تھا جو جائز و درست نہیں ہو سکتا۔ دوسرے یہ کہ یزید اپنے خصائل و کردار کے لحاظ سے متقی و پرہیزگار انسان تھا۔ شریعتِ اسلامی کا پابند تھا۔ اس لئے اس کے

خلاف خروج کرنے کا یہ بہانہ بھی نہیں ہو سکتا کہ وہ فاسق و فاجر، ظالم و جابر خلیفہ تھا۔

اسی سلسلے میں مولانا عباسی نے واقعۂ کربلا اور شہادتِ حسین کے متعلق تاریخی حیثیت سے، جو نقد و تبصرہ کیا ہے وہ بھی ایک حد تک شیعی حضرات کے مسلمات کے خلاف ہے۔

بہرحال یہ تصنیف اس حیثیت سے کہ وہ حسین اور یزید کے بارے میں بہت سے مروجہ خیالات کی تغلیط کرتی ہے، خاص اہمیت رکھتی ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ تحفۂ اثنا عشریہ اور آیات بینات کے بعد یہ تیسری کتاب ہے جو شیعی جماعت کے خلاف ایک بڑے چیلنج کی حیثیت رکھتی ہے اور ہو سکتا ہے کہ جس طرح شیعی علماء نے تحفہ اور آیات بینات کا جواب لکھا، اسی طرح اس کتاب کی تردید میں بھی وہ بہت کچھ لکھیں،

اس اجمال کے بعد اب ہم ذرا تفصیل کے ساتھ بتانا چاہتے ہیں کہ مولانا عباسی کی دعاوی کیا ہیں؟

(۱) پہلا دعوے یہ ہے کہ قتل عثمان سے لے کر شہادت حضرت علیؓ تک کا جتنا زمانہ فساد و خونریزی اور انتشار و اختلال کا گذرا ہے۔ اس کی بڑی ذمہ داری عبداللہ بن سبا اور سبائی جماعت پر عائد ہوتی ہے۔

(۲) دوسرا دعویٰ یہ ہے کہ یزید، معاویہ کا جائز جانشین تھا۔ اور چونکہ اس کی خلافت جمہور کی تسلیم کردہ خلافت تھی۔ اس لئے حسین کا

خروج یزید کے خلاف ناجائز تھا۔

(۳) تیسرے یہ کہ یزید کے فسق و فجور کی روایات بالکل غلط ہیں۔ وہ بڑے پاکیزہ اخلاق و بلند کردار کا انسان تھا اور مے نوشی و فسق و فجور کے جو الزامات اس پر لگائے جاتے ہیں وہ بالکل بے بنیاد ہیں۔

(۴) چوتھے یہ کہ کربلا کے واقعات جو شیعی جماعت کی طرف سے بیان کئے جاتے ہیں وہ حد درجہ مبالغہ آمیز ہیں، حادثۂ کربلا زیادہ سے زیادہ آدھ گھنٹے کی بات تھی۔ یہاں تک کہ حسین کو بھی کسی سے نبرد آزمائی کا موقع نہ ملا۔

اس میں شک نہیں کہ عباسی صاحب نے جو کچھ لکھا ہے اس پر وہ تاریخی و روائتی شواہد و دلائل بھی لائے ہیں۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ جس طرح عباسی صاحب شیعی راویوں کو غالی و ناقابل اعتبار قرار دے کر ان کی روایات کو غلط کہہ سکتے ہیں۔ اسی طرح شیعی جماعت بھی غیر شیعی روایات کی صحت سے انکار کر سکتی ہے۔ روایات کی کمی نہیں۔ ایک انبار ہے جس سے ہر شخص اپنے دعوے کا ثبوت پیش کر سکتا ہے۔ پھر ایک بات اور بھی ہے۔ وہ یہ کہ اگر روایات متضاد و متعارض نہ ہوں تو یہ بھی ضروری نہیں کہ ان سے ہر شخص ایک ہی نتیجہ اخذ کرنے پر مجبور ہو ——— اختلاف نیت و ذہن سے استنتاج بھی بدل جایا کرتا ہے۔

اس صورت میں ایک تیسرے شخص کے لئے اس کے سوا چارہ نہیں کہ وہ ان روایات کی تنقیح میں درائت سے کام لے کر رد و قبول کا فیصلہ کرے۔ اور یہ

اسی وقت ممکن ہے جب اس عہد کی پوری سیاسی تاریخ اور عربوں کی بدلتی ہوئی ذہنیت کو سامنے رکھا جائے، کیونکہ خروج حسین کا تعلق خلافتِ یزید سے۔ خلافتِ یزید کا تعلق امارت معاویہ سے، معاویہ کی سیادت کا تعلق حضرت عثمان کی پالیسی سے، اور حضرت عثمان کی پالیسی کا تعلق عہد فاروقی کے اصول حکمرانی سے اتنا گہرا ہے کہ جب تک ان تمام باتوں کو سامنے نہ رکھا جائے۔ ہم تاریخی و عقلی نقطۂ نظر سے کوئی صحیح فیصلہ نہیں کر سکتے۔ اور اگر اسی میں حضرت علی کے عہد خلافت کی اُلجھنوں، جمل و صفین کی لڑائیوں اور خوارج کے خروج کو بھی سامنے رکھیں (جو ضروری باتیں ہیں) تو پھر بات بہت بڑھ جاتی ہے۔

افسوس ہے کہ میں اس وقت پوری تفصیل سے کام نہیں لے سکتا کیونکہ اس کے معنی یہ ہوں گے کہ اس کتاب کی بہت سی عبارتوں کو نقل کر کے ان میں سے ہر ایک پر علیحدہ علیحدہ اظہار خیال کیا جائے اور اس کی گنجایش تبصرہ میں کہاں؟ تاہم محض تبصرہ کی حد تک بھی اس سے مفر نہیں کہ اس عہد کی سیاست سمجھنے کے لئے پہلے خلافت عثمان سے لے کر واقعۂ کربلا تک کی تاریخ پر ایک سرسری نظر ڈال لی جائے۔ اور پھر غور کیا جائے کہ اس کتاب کے فاضل مصنف جن نتائج پر پہنچے ہیں وہ صحیح ہیں یا غلط۔

عہد نبویؐ سے لے کر عہد علی تک جو زمانہ گذرا ہے۔ عموماً اسے دو حصوں میں تقسیم کیا جاتا ہے، ایک عہد رسالت، دوسرا عہد خلافتِ راشدہ جو ابوبکر سے شروع ہو کر حضرت علی پر ختم ہوتا ہے لیکن سیاسی حیثیت سے

اس کو تین زمانوں میں تقسیم کرنا چاہیئے۔ اولین دور عہد نبوی سے خلافت ابوبکر تک، دوسرا دور خلافت عمر کا (جو اپنی جگہ ایک مستقل دور تھا) تیسرا دور خلافت عثمان و علی کا۔

میں نے یہ تقسیم اس لئے کی ہے کہ عہد نبوی سے لے کر وفات ابوبکر تک مسلمانوں کی زندگی قریب قریب یکساں رہی اور اس میں کوئی خاص تبدیلی نہیں ہوئی ——— ہر چند رحلت نبوی کے بعد ابوبکر نے عرب فوجوں کو دعوت اسلام کے لئے بیرونی ممالک میں بھیجا اور اس سلسلے میں فتوحات بھی ہوئیں لیکن عربوں کی زندگی اور ذہنیت میں کوئی خاص تبدیلی نہ ہو سکی اور فتوحات کا سلسلہ بھی زیادہ وسیع نہ ہو سکا۔

اس کے بعد حضرت عمر کا دور خلافت شروع ہوا جو سیاسی و تمدنی دونوں حیثیتوں سے نیا دور تھا۔

اس عہد کے سیاسی موقف کا ذکر ڈاکٹر طٰہٰ حسین نے ان الفاظ میں کیا ہے "شام، مصر اور جزیرۃ العرب سے رومیوں کو نکالا جا چکا تھا اور ایرانی اثر و اقتدار کو ختم کر کے ان کے مستعمرات کو اسلامی سلطنت میں شامل کرنے کی تدابیر بروئے کار آ رہی تھیں۔ یہ بڑا اہم کام تھا اور اس کی تکمیل کے لئے نہ صرف ایک مضبوط ترقی یافتہ جنگی سیاست کی ضرورت تھی بلکہ ایک طاقتور فوج بھی درکار تھی اور اس فوج کی تشکیل انہیں عرب بدوؤں سے کرنا تھی جنہیں اس وقت تک نہ کسی منظم و تربیت یافتہ لشکر سے مقابلہ کرنے کا تجربہ تھا اور نہ وہ اس نوع کی باقاعدہ جنگ کے اصول سے واقف تھے۔

مسلمانوں کی یہ جدید معرکہ آرائیاں نہ صرف ایام جاہلیت کی لڑائیوں سے مختلف تھیں بلکہ عہد نبوی کے غزوات سے بھی مختلف تھیں اور عربوں میں باقاعدہ و منظم عسکریت پیدا کرنا ان کے لئے بالکل نیا تجربہ تھا، نئی زندگی تھی۔ نئی دشوار گزار منزل تھی۔ اس میں شک نہیں کہ اس نازک دور سے کامیاب گزر جانا محض تصرف تھا حضرت عمرؓ کی فراست و تدبر کا۔

پھر حضرت عمرؓ کے سامنے صرف اجتماع ہی کا سوال نہ تھا۔ بلکہ اس سلسلہ میں اور بہت سے ایسے اہم مسائل پر بھی انھیں غور کرنا تھا۔ مثلاً نئے شہروں اور چھاؤنیوں کی تعمیر، فوجوں کی نقل و حرکت کا انتظام، عسکری دفاتر کی تنظیم فوجیوں کی اسم وار فہرست کی ترتیب، سپاہیوں کے افراد خاندان کی تفصیل (جن کی کفالت حکومت پر فرض تھی) اور جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ یہ تمام تبدیلیاں ایسی قوم میں پیدا کی جا رہی تھیں جو حساب و کتاب اور نظم و ترتیب سے بالکل ناآشنا تھی تو ہم تھوڑا بہت اندازہ کر سکتے ہیں کہ حضرت عمرؓ کو ان تمام گتھیوں کے سلجھانے میں کتنی غیر معمولی جد و جہد اور کتنی زبردست سوجھ بوجھ سے کام لینا پڑا ہوگا۔

پھر حضرت عمرؓ کے سامنے صرف جنگی سیاست ہی کی دشواریاں نہ تھیں بلکہ عام نظم و نسق کے بھی اہم مسائل آپ کے سامنے تھے۔ مفتوحہ ممالک کا انھیں کے مروجہ اصول کے مطابق انتظام کرنا عربوں میں نظم و نسق کی اتنی سوجھ بوجھ پیدا کرنا کہ وہ مفتوحہ قوموں کی سازشوں سے محفوظ رہ کر قیام امن اور مزید عسکری اقدامات کے وسائل پر بہ آسانی قابو پا سکیں، نیز یہ کہ وہ

مفتوحہ قوموں کے عادات وخصائل اختیار کرکے اپنی قومی خصوصیات کی سادگی کو ترک نہ کریں۔ کثرت فتوحات سے مغرور ہوکر وہ جبر و تعدّی پر نہ اُتر آئیں، خوش حالی کی زندگی کو ترک کرکے وہ عیش و راحت کی زندگی نہ بسر کرنے لگیں۔ اسی کے ساتھ عربوں کے داخلی مسائل بھی کم اہم نہ تھے جن میں سب سے زیادہ اہم بدوی قبائل کو قابو میں رکھنا تھا اور ان سے نبٹنے کے لئے بڑی مستحکم سیاسی پالیسی کی ضرورت تھی۔

حضرت عمرؓ اس سے بھی اچھی طرح واقف تھے کہ جب کوئی قوم پستی سے نکل کر مائل بہ عروج ہوتی ہے اور فتوحات کے ذریعہ سے معمولی دولت اس کے ہاتھ آتی ہے تو وہ طبعاً عیش و تن آسانی کی طرف مائل ہو جاتی ہے۔ اور چونکہ حضرت عمرؓ کے زمانے میں غیر معمولی فتوحات کی وجہ سے مال غنیمت بکثرت ہاتھ آتا تھا اس لیئے انھیں اس کا بھی لحاظ رکھنا تھا کہ یہ دولت محض ان کی ضرورتوں کے لحاظ سے تقسیم کی جائے اور اس باب میں اس قدر سخت تھے کہ بڑے بڑے صحابہ بھی مستثنیٰ نہ تھے، اور نہ خود ان کے افراد خاندان۔

ان تمام باتوں سے آپ اندازہ کرسکتے ہیں کہ حضرت عمرؓ کے زمانے میں کاروبار سیاست و حکومت کتنا وسیع ہوگیا تھا اور اس کو سنبھالنا کس قدر دشوار تھا۔ اسی لئے جس وقت آپ اس دنیا سے رخصت ہونے لگے تو آپ کو سب سے بڑی فکر یہی تھی کہ یہ بوجھ کس پر ڈالا جائے اور جب وہ خود اس کا فیصلہ نہ کرسکے تو اپنی جانشینی کا فیصلہ ایک مجلس شوریٰ کے سپرد کردیا۔

حضرت عمرؓ کے بعد دعویدارانِ خلافت تو کئی ایک تھے لیکن ان میں

سے سب سے زیادہ نمایاں ہستیاں دو تھیں۔ ایک علیؓ دوسرے عثمانؓ کی لیکن اصل سوال یہ تھا کہ ان میں سے کون ایسا ہے جو حضرت عمرؓ کی قائم کردہ اندرونی و بیرونی سیاست کو کامیابی کے ساتھ آگے بڑھا سکتا ہے۔ اسی لئے عبدالرحمٰن بن عوف نے (جو مجلسِ شوریٰ کے سرپنچ تھے) سب سے پہلے حضرت علیؓ سے استمزاج کیا (کیونکہ وہ ان کو زیادہ اہل سمجھتے تھے) لیکن انھوں نے حضرت عمرؓ کی پالیسی پر عمل کرنے کا اقرار نہیں کیا (جو یقیناً اُن کے کردار کی بڑی بلندی تھی) اور کہا کہ میں وہ کروں گا جو حالات کے لحاظ سے مناسب ہوگا اور عمرؓ کی پالیسی کے موافق بھی ہو سکتا ہے اور ناموافق بھی۔

اس کے بعد عبدالرحمٰن بن عوف نے حضرت عثمانؓ کے سامنے یہی شرط رکھی اور جب انھوں نے بلا تامل اس کو تسلیم کر لیا تو عبدالرحمٰن نے ان کے ہاتھ پر بیعت کر لی اور اس طرح وہ خلیفہ ہو گئے۔ لیکن اس سے یہ نہ سمجھ لینا چاہیئے کہ یہ فیصلہ صرف مجلسِ شوریٰ کے چند مخصوص اشخاص کا تھا۔ بلکہ یہ فیصلہ دراصل وہاں کے تمام اکابر کا تھا، کیونکہ افرادِ بنی امیہ، رسول اللہ کے زمانہ ہی میں کافی اثر و اقتدار حاصل کر چکے تھے اور ابوبکرؓ و عمرؓ کے عہد میں بھی انھوں نے بڑی اہم خدمات انجام دی تھیں۔ اس لیے عمرؓ کے بعد عثمانؓ کا خلیفہ ہونا، اس وقت کی عام ذہنیت کا بھی اقتضاء تھا اور اس میں شک نہیں کہ ان کی خلافت کے ابتدائی چھ سال ایسے گزرے کہ اگر حالات کی رفتار وہی رہتی تو آج تاریخ اسلام کچھ اور ہوتی۔ لیکن افسوس ہے کہ یہ دورِ امن و ترقی چھ سال کے بعد دفعتاً رک گیا اور لوگوں میں خلافت و حکومت کی طرف سے

بدظنی پیدا ہونا شروع ہو گئی۔

عثمان پر بڑا الزام یہ قائم کیا جاتا ہے کہ انھوں نے اپنے دورِ خلافت میں اپنے قبیلے والوں کو بہت بڑھایا اور دوسرے لوگوں کو نظر انداز کر دیا۔ یہ ایک حد تک درست ہے لیکن اس سے یہ نتیجہ نکالنا کہ ان کا مقصود محض اقربا پروری تھی، صحیح نہیں۔ انھوں نے اگر یہ پالیسی اختیار کی تو یہ تقاضا تھا وقت کا اور زمانے کے حالات کا۔

حضرت عمر کے زمانے میں دیوانی سسٹم اس اصول پر قائم تھا کہ مالِ غنیمت میں برابر اضافہ ہوتا رہے۔ کیونکہ زمینوں سے جو ٹیکس یا جزیہ وصول ہوتا تھا، وہ اتنا نہ تھا کہ بڑھتے ہوئے فوجی مصارف کو پورا کر سکتا۔ چنانچہ اسی پالیسی کی بدولت ایران، آرمینیا، افریقہ، ایشیائے کوچک کی مہمیں کامیاب ہوئیں اور ان کامیابیوں میں بڑا ہاتھ امویین ہی کا تھا۔ اسی لئے حضرت عمر کے زمانے میں بھی اموی اثرات کچھ کم نہ تھے۔ اور جو مالِ غنیمت ہاتھ آتا اس کا ایک حصہ فوج پر تقسیم کر دینے کے بعد جو بچ رہتا تھا اس کا ایک حصہ بیت المال میں رکھ دیا جاتا تھا اور باقی سب گورنروں کے ذاتی مصارف کے کام آتا تھا۔ اسی عمل کو حضرت عثمان نے بھی جاری رکھا جس سے اصل مقصود اموی سرداروں کو دولتمند بنانا نہ تھا بلکہ ان کو اس سطح پر لے آنا تھا کہ وہ بیزنطینی اور ایرانی حکومتوں کے مقابلہ میں ایک باضابطہ حکومت قائم کر کے ان پر اپنا رعب و اثر ڈال سکیں۔ یہ تھا وہ بنیادی خیال جس کو حضرت عمر نے عملی صورت دی، بنو اُمیہ نے آگے بڑھایا اور عباسیین نے اس سے پورا فائدہ اٹھایا۔

پھران حالات کے پیش نظر حضرت عثمان پر یہ الزام تو یقیناً قائم نہیں ہو سکتا کہ اموئیین کے ساتھ ان کی رعایت محض جذبۂ اقربا نوازی کا نتیجہ تھی لیکن اسی کے ساتھ یہ بھی ماننا پڑے گا کہ عہد عثمان میں افراطِ دولت کی وجہ سے ایک طبقہ امراء کا ضرور پیدا ہو گیا اور اسی کے ساتھ وہ اقتصادی عدم توازن بھی جو ہمیشہ HAVE اور HAVE NOT کے درمیان کشاکش کا باعث ہوا کرتا ہے۔

اتفاق سے اسی زمانے میں حضرت عثمان نے اس خیال سے کہ اختلاف قرأۃ کی بنا پر قرآن مسخ نہ ہو جائے۔ اس کے تمام نسخے جمع کرا کے ایک صحیح نسخہ اس کا مرتب کیا۔ اور باقی تمام نسخے تلف کر دیئے۔ اس واقعہ نے نہ صرف قراء کو برہم کر دیا بلکہ بعض قدر دوم کے صحابہ بھی (جیسے عمار بن یاسر، ابوذر، عبد اللہ ابن مسعود) ناراض ہو گئے اور عوام پر بھی اس کا اثر پڑا۔ اسی کے ساتھ دوسرا واقعہ یہ پیش آیا کہ رسول اللہ کی انگوٹھی جو ابوبکر و عمر کے بعد عثمان کو ملی تھی۔ ان سے گم ہو گئی اور بعض وہم پرست لوگوں نے اس کو بھی شگون بد سمجھا۔

پھر ہو سکتا ہے کہ عوام کے دلوں پر ان باتوں کا بھی اثر ہوا۔ لیکن اصل سبب مخالفت عثمان کا وہی اقتصادی عدم توازن تھا جو اموی امراء کے خلاف عوام میں نفرت و انتقام کا جذبہ ابھار رہا تھا اور اس کو ہوا دینے والے بعض معزول شدہ امراء بھی تھے اور بعض وہ صحابہ بھی جو خود خلافت کے خواہاں تھے (مثلاً طلحہ و زبیر)

الغرض یہ تھے وہ حالات جنھوں نے عہد عثمان میں اسلامی حکومت کی سالمیت کو خطرے میں ڈال دیا۔ اور وہ اس کا کوئی مداوا نہ کر سکے۔ کیونکہ اوّل تو ان کی شخصیت حضرت عمر کی سی شخصیت نہ تھی جو ان حالات کا مقابلہ کامیابی سے

کرسکتی۔ دوسرے یہ کہ ان کے مشیر بھی اچھے نہ تھے اور جن امویین کو اُنھوں نے اقتدار بخشا وہ صرف امیر و سرمایہ دار بن کر رہ گئے۔ اور خدمت اسلام فراموش کر بیٹھے اس لئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ اگر عہد عثمان کے ابتدائی چھ سال امن و فلاح کے گذرے تو اس کا سبب حضرت عثمان کی اہلیت نہ تھی بلکہ یہ محض MOMENTUS تھا عہد عمر کے برکات کا جس کے ختم ہونے پر دَورِ انتشار و افتراق شروع ہوگیا اور سب سے پہلے ۳۳ھ میں عراق کے اندر آثار بغاوت شروع ہوئے (کیونکہ اقتصادی بدحالی یہیں زیادہ پائی جاتی تھی) اس کے بعد ۳۴ھ و ۳۵ھ میں یہیں قراء کی جماعت نے سر اُٹھایا (جو نیم مذہبی و نیم سیاسی تحریک تھی) اور مجبوراً سعید بن العاص کو ہٹا کر کوفہ کا گورنر ابو موسیٰ الاشعری کو بنانا پڑا جو قراء کے ہمنوا اور مخالفین عثمان میں سے تھے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ کوفہ سے اقتدار خلافت اُٹھ گیا۔ اسی کے ساتھ مصر میں بھی بےچینی شروع ہوگئی اور محمد بن حذیفہ نے (باوجودیکہ وہ عثمان کے متبنیٰ تھے) مخالفین کا ساتھ دے کر صورت حال اور نازک کردی۔ کہا جاتا ہے کہ اس میں عمرو بن العاص کا ہاتھ زیادہ تھا جو معزولی کے بعد فلسطین چلے گئے تھے۔ اور مصر کے باغی طبقہ کو شہ دے رہے تھے۔

بہرحال حضرت عثمان کی مخالفت آہستہ آہستہ بڑھتی جارہی تھی اور ۳۵ھ میں اس نے اتنی شدت اختیار کرلی کہ باغیوں کی جماعتیں دارالخلافت مدینہ کی طرف چل پڑیں جن میں مصری جماعت پیش پیش تھی۔

مدینہ پہنچ کر اُنھوں نے نہایت سختی کے ساتھ حضرت عثمان سے اپنی شکایات کا مداوا چاہا اور جب انھوں نے اکثر مطالبات تسلیم کرلیئے تو مصری جماعت مطمئن

ہو کر واپس جانے لگی، لیکن اتفاق سے راستہ میں بمقام العریش انھیں حضرت عثمان کا ایک قاصد ملا جو ابن ابی سرح (حاکم مصر) کے پاس عثمان کا ایک خط لئے جا رہا تھا جس میں تحریر تھا کہ مصر جانے پر باغیوں کے سرداروں کو قتل کر دیا جائے۔ یہ خط ان کے ہاتھ پڑ گیا۔ اور انتہائی غیظ و غضب کے عالم میں وہ پھر اُلٹے پاؤں مدینہ واپس آ گئے۔ ہر چند اس خط کے لکھنے سے حضرت عثمان نے انکار کیا۔ ہو سکتا ہے کہ مروان یا کسی اور دشمن نے یہ جعلی خط بھیجا ہو) لیکن باغیوں نے اس کو باور نہیں کیا اور عثمان کے گھر کا محاصرہ کر لیا۔

مدینہ میں اس وقت متعدد صحابہ موجود تھے لیکن ان میں سے اکثر عثمان کے مخالف تھے۔ اس لیے انھوں نے کوئی مدد نہیں کی۔ حضرت عائشہ حج کے بہانے سے مکہ چلی گئیں۔ حضرت علی البتہ بیچ میں پڑے لیکن وہ کوئی ایسا مضبوط قدم نہ اُٹھا سکے جو اس ہنگامہ کو فرو کر سکتا۔ آخر کار چند دن کے محاصرہ کے بعد (۳۵ھ کے اختتام پر) باغیوں کی یہ جماعت محمد بن ابی بکر (حضرت عائشہ کے بھائی) کی سرکردگی میں گھر کے اندر داخل ہو گئی۔ عثمان کو قتل کر دیا اور تاریخ کا وہ دور شروع ہوا جو عہد اسلام کا سب سے بڑا دورِ فتنہ و ابتلا تھا اور جس نے مسلمانوں کی ہیئت اجتماعی اور اس کی سالمیت کو ہمیشہ کے لئے ختم کر دیا۔

قتل عثمان کا واقعہ کوئی معمولی واقعہ نہ تھا ایک خلیفہ کا قتل تھا اور خود مسلمانوں کے ہاتھ سے! سارے مدینہ میں اضطراب برپا ہو گیا اور لوگوں کو یہ فکر لاحق ہوئی کہ اب خلافت کس کے سپرد کی جائے۔ سب کی نگاہ حضرت علی کی طرف تھی لیکن وہ حال کی پیچیدگیوں اور مستقبل کے خطرات کے پیش نظر اوّل اوّل تو

بالکل خاموش رہے۔ لیکن جب مہاجرین و انصار نے بہت مجبور کیا تو آپ راضی ہو گئے مگر اسی کے ساتھ یہ بھی کہہ دیا کہ میں بیعت پر کسی کو مجبور نہیں کرتا۔ جس کے مزاج میں آئے بیعت کرے جس کے مزاج میں آئے نہ کرے۔ چنانچہ سعد بن ابی وقاص، عبداللہ بن عمر، اسامہ بن زید نے بیعت نہیں کی اور محمد بن مسلمہ کی سرکردگی میں بعض انصار نے بھی بیعت سے انکار کر دیا۔ حضرت علی نے کچھ نہیں کہا، لیکن جب طلحہ و زبیر نے بھی انکار کر دیا تو انھیں فکر لاحق ہوئی کہ قتل عثمان کے مسئلہ میں ضرور فتنہ بپا کریں گے اس لئے انھیں ضرور بیعت پر مجبور کیا اگرچہ بعض کا خیال ہے کہ وہ بعد کو خود راضی ہو گئے تھے)

بہرحال حضرت علی ۲۵ ذی الحجہ ۳۵ھ (۲۴ جون ۶۵۶ء) کو منصب خلافت پر فائز ہو گئے لیکن اس کے بعد ہی آپ کو دوسرے ہنگامہ سے دوچار ہونا پڑا یعنی پہلے اگر ہنگامہ عثمان کے خلاف تھا تو اب خود ابن عثمان نے علی سے قاتلان عثمان سے قصاص کا مطالبہ شروع کر دیا۔ اور اس طرح حضرت علی کی خلافت کا آغاز ہی ہنگامہ و شورش سے ہوا۔ حضرت علی مطالبہ قصاص کو تو درست سمجھتے تھے لیکن سوال یہ تھا کہ اس جرم میں کس سے باز پرس کی جائے جبکہ اصل قاتل کا علم کسی کو نہ تھا۔

حقیقت یہ ہے کہ مطالبہ قصاص تو صرف بہانہ تھا۔ اصل مدعا تو یہ تھا کہ علی کے خلاف شورش برپا کر کے ان کی خلافت کو کامیاب نہ ہونے دیا جائے

اس سلسلے میں سب سے پہلی جنگ حضرت علی کو عائشہ، طلحہ و زبیر سے بصرہ میں کرنا پڑی جو جنگ جمل کے نام سے مشہور ہے اور اس میں آپ

کامیاب ہوئے لیکن اس کے ایک مہینہ بعد ہی اس سلسلہ میں آپ کو شامیوں کے مقابلہ میں جانا پڑا اور صفین میں امیر معاویہ کی فوجوں سے مقابلہ شروع ہوا۔ یہ جنگ ۱۰ دن (ذی الحجہ ۳۶ھ تا صفر ۳۷ھ) جاری رہی لیکن ٹھیک اس وقت جبکہ الاشتر کی غیر معمولی بہادری کی وجہ سے آپ تقریباً کامیاب ہو چکے تھے۔ عمرو بن العاص نے یہ چال چلی کہ میدان جنگ میں قرآن کی ۵۰۰ کاپیاں نیزوں پر بلند کرا کے یہ مطالبہ شروع کیا کہ جنگ بند کر دی جائے اور فیصلہ خدا پر چھوڑ دیا جائے علی اس چال کو سمجھ گئے تھے، لیکن معاملہ قرآن کا تھا۔ اس لئے وہ اس کی مخالفت بھی نہ کر سکتے تھے، دوسرے یہ کہ خود ان کی فوجیں لڑتے لڑتے تھک چکی تھیں۔ اور دم لینے کا کوئی بہانہ ڈھونڈھتی تھیں۔ مجبوراً علی کو بھی یہ مطالبہ ماننا پڑا اور فیصلہ کے لئے معاویہ کی طرف سے عمرو بن العاص حکم منتخب کئے گئے اور علی اپنی طرف سے ابو موسیٰ الاشعری کو حکم بنانے کے لئے مجبور کئے گئے۔ اس کے بعد ایک تحریری معاہدہ (رمضان ۳۷ھ) کے ذریعہ سے ان دونوں کو فیصلے کا اختیار دے دیا گیا۔ عمرو بن العاص تو خیر کھلم کھلا معاویہ کے طرفدار تھے، لیکن ابو موسیٰ الاشعری نہ معاویہ کے موافق تھے نہ علی کے بلکہ اپنے داماد عبداللہ بن عمر کو خلیفہ بنانا چاہتے تھے، مگر اس کا موقعہ کہاں تھا کہ وہ علی اور معاویہ کے مقابلہ میں اپنے داماد کو خلیفہ بنا سکتے۔ اس لئے عمرو بن العاص نے انھیں بھی ہموار کر لیا اور اس طرح جنگ صفین کا انجام یہ ہوا کہ معاویہ کو خلیفہ تسلیم کر لیا گیا۔ لیکن یہ فیصلہ ایسا نہ تھا جسے سب تسلیم کر لیتے۔ اس لئے معاہدہ پر دستخط ہونے کے بعد علویین کی ایک جماعت خود حضرت علی کی مخالف ہو گئی اور

"عبداللہ بن وہب" کی سرکردگی میں چار ہزار آدمیوں نے "لاحکم الا للہ" کے نعرے کے ساتھ علی کے خلاف بغاوت کر دی اور اس فتنۂ خوارج کے خلاف نہروان میں انھیں بڑی زبردست جنگ کرنا پڑی۔

اس طرف علی ان الجھنوں میں گرفتار تھے۔ دوسری طرف امیر معاویہ علی کی پریشانیوں سے فائدہ اُٹھا کر اپنا اثر و رسوخ بڑھانے کی کوشش کر رہے تھے کہ اسی دوران میں ایک خارجی ابن ملجم نے حضرت علی کو شہید کر دیا' امیر معاویہ کے لئے میدان صاف ہو گیا۔ اور اس طرح دورِ خلافت ختم ہو کر اسلام کا دور ملوکیت شروع ہو گیا۔

علی کی شہادت کے بعد عراقیوں نے ان کے بڑے فرزند حسن کی خلافت کا اعلان کر دیا۔ اور معاویہ کے خلاف اپنے والد کی مہموں کو جاری رکھنے پر اصرار کیا' لیکن وہ فطرتاً بڑے صلح پسند تھے اور آرام و سکون کی زندگی چاہتے تھے اسی کے ساتھ وہ یہ بھی جانتے تھے کہ معاویہ کی بڑھتی ہوئی قوت سے ٹکر لینا آسان نہیں' اس لئے انھوں نے معاویہ سے صلح کرنا زیادہ مناسب سمجھا اور اس غرض سے اپنے دو سفیر (عمرو بن مسلمہ۔ محمد بن الاشعث) شرائط معاہدہ طے کرنے کے لئے امیر معاویہ کے پاس بھیجے۔ امیر معاویہ نے تمام شرائط تسلیم کرتے ہوئے حسن کو لکھ بھیجا کہ "میرے بعد خلافت تمھاری طرف منتقل ہو گی۔ بیت المال سے ہر سال دس لاکھ درہم تم کو ملتے رہیں گے اور ایران کے دو ضلعوں کا خراج بھی تم اپنے عمال کے ذریعہ وصول کرتے رہو گے"

اس معاہدہ کے بعد لوگوں کے کہنے سے حسن کو خیال آیا کہ یہ سب کچھ ہو گیا لیکن ان علوئین کے تحفظ کا مسئلہ رہ گیا۔ جنھوں نے معاویہ سے جنگ کی تھی۔ اس لئے انھوں نے اب حارث بن نوفل کو امیر معاویہ کے پاس یہ کہلا بھیجا کہ "اگر تم علوئین کے تحفظ جان کا معاہدہ کرو تو میں بیعت کے لئے تیار ہوں۔"

امیر معاویہ نے اس کے جواب میں ایک سادہ کاغذ اپنی مہر لگا کر بھیجدیا اور کہلا بھیجا کہ جو شرائط چاہو لکھ دو مجھے سب منظور ہیں۔

حسن اب بالکل مطمئن ہو گئے لیکن غلطی کہئے یا بھول، حسن نے اپنی اور شرائط تو لکھدیں لیکن اپنی "ولی عہدی" کی شرائط کی جگہ یہ لکھدیا کہ معاویہ اپنی زندگی میں کسی کو ولی عہد نامزد نہ کریں گے بلکہ اس مسئلہ کو شوریٰ پر چھوڑ دیں گے۔

اس میں شک نہیں کہ حسین، معاویہ سے صلح کرنے کے خلاف تھے لیکن اپنے بڑے بھائی کے اصرار سے وہ بھی مجبور ہو گئے اور انھوں نے بھی امیر معاویہ کی بیعت کر لی۔

اس کے بعد حسن آٹھ نو سال زندہ رہے اور ۴۹ھ میں بہ عارضۂ دق انتقال کیا۔ یہ روایت کہ معاویہ نے ان کی بیوی ہند بنت سہیل بن عمرو کے ذریعہ سے زہر دلوا دیا، مشتبہ ہے۔ گو عہد معاویہ میں ایسی سیاسی چالوں کی مثالیں بھی ملتی ہیں۔ مثلاً الاشتر کی موت کو جس کی نسبت خیال کیا جاتا ہے کہ معاویہ نے مصر جاتے ہوئے راستہ میں اُسے ہلاک کر دیا تھا تاکہ مصر پر پوری طرح تسلط قائم ہو سکے۔ یا عبدالرحمٰن بن خالد کا حمص میں زہر سے ہلاک ہونا۔ اس لئے ہو سکتا ہے کہ معاویہ نے حسن کو اس لئے زہر

دلوا دیا ہو کہ ان کے بعد میدان یزید کے لئے بھی صاف ہو جائے گا لیکن یقین کے ساتھ کچھ نہیں کہا جا سکتا۔

حسن کے انتقال کے وقت حسین مدینہ میں خاموش زندگی گزار رہے تھے اور معاویہ کے معاملات میں کوئی دخل نہ دینا چاہتے تھے۔ یہاں تک کہ حسن کے انتقال کے بعد علوئین نے انھیں اپنا قائد و سردار تسلیم کر لیا۔ لیکن اس وقت بھی انھوں نے معاویہ کے خلاف کوئی قدم نہیں اٹھایا گو ان کی جماعت کے اکثر افراد انھیں معاویہ کے خلاف خروج پر آمادہ کر رہے تھے۔ بعد کو جب معاویہ نے یزید کی جانشینی پر لوگوں سے عہد لیا تو امام حسین کی رائے بدلی اور اہل عراق کے اصرار پر انھوں نے یزید کے خلاف خروج کا ارادہ کر لیا لیکن قبل اس کے کہ وہ کوئی عملی قدم اٹھاتے۔ انھوں نے اپنے عم زاد بھائی مسلم بن عقیل کو کوفہ بھیجا تاکہ وہ خود وہاں کے حالات کا مطالعہ کر کے مطلع کریں۔ مسلم جب کوفہ پہنچے تو ہزاروں علوئین ان کے پاس جمع ہو گئے، اور ان کی یہ زبردست آمادگی دیکھ کر مسلم نے حسین کو لکھا کہ کہ وہ کوفہ آجائیں لوگ ان کی خلافت تسلیم کرنے پر آمادہ ہیں ——— چنانچہ حسین کوفیوں کی امداد پر بھروسہ کر کے ذی الحجہ میں حج سے فارغ ہو کر کوفہ کی طرف مع اہل و عیال چل پڑے۔ ہر چند بعض حضرات نے مشورہ دیا کہ وہ تنہا جائیں اور متعلقین کو ساتھ نہ لے جائیں۔ لیکن وہ نہیں مانے۔ غالباً اس لئے کہ یزید کے خلاف خروج کرنے کے بعد ان کو اندیشہ پیدا ہو گیا تھا کہ ان کے پیچھے ان کے اہل و عیال کو مدینہ میں پریشان کیا جائے گا۔ بہر حال

وہ پورے خاندان کو لے کر کوفہ کی طرف چل پڑے۔ لیکن اس دوران میں کوفہ کے حالات بہت کچھ بدل گئے تھے۔ کیونکہ جب یزیدی گورنر کوفہ عبیداللہ بن زیاد کو مسلم کی کارروائیوں کا علم ہوا تو اس نے مسلم کو قتل کرا دیا۔ اور اس طرح تمام وہ افراد جو حسین کی امداد پر آمادہ تھے منتشر ہو گئے۔ مسلم نے اپنے قتل سے پہلے ان حالات کی اطلاع حسین کو دے دی تھی۔ اور ان کو کوفہ آنے سے روک دیا تھا۔ لیکن حسین کو یہ اطلاع اس وقت ملی جب وہ حدود کوفہ میں پہنچ چکے تھے۔ یہ خبر سن کر اس میں شک نہیں کہ وہ بہت متردد ہوئے۔ لیکن اب سوال واپسی کا بھی نہیں تھا۔ کیونکہ ابن زیاد نے کوفہ سے حجاز تک اکثر جگہ فوجی چوکیاں بٹھا دی تھیں اور سواروں کے دستے راستہ پر گشت کر رہے تھے۔ اس لئے جب حسین آگے بڑھے تو انھیں فوجی دستوں میں سے ایک دستہ نے ـــــ آگے بڑھنے سے روکا اور جب وہ کربلا تک پہنچے تو یزیدی فوجوں نے عمر بن سعد کی سرکردگی میں گھیرا ڈال دیا۔ یہ حالات دیکھ کر حسین بہت متردد ہوئے۔ اور چونکہ انھیں اپنی ناکامی کا یقین ہو گیا تھا۔ اس لئے انھوں نے عمر بن سعد سے کہا کہ میں لڑنا نہیں چاہتا یا تو ہمیں حجاز کی طرف واپس جانے دیا جائے یا دوسری مجاہد فوجوں سے مل کر دشمنانِ اسلام سے جنگ کا موقع دیا جائے۔ یا پھر شام کی طرف جانے دیا جائے کہ وہ خود یزید سے دوبدو گفتگو کریں، نتیجہ چاہے کچھ ہو۔ اس کی اطلاع عمر بن سعد نے ابن زیاد کو دی۔ ابن زیاد نے شمر بن ذی الجوشن کے ذریعہ سے ہدایت لکھ بھیجی کہ حسین جب تک بیعتِ یزید پر راضی نہ ہو جائیں۔ ان کی کوئی بات نہ مانی جائے۔

اور شمر کو زبانی ہدایت کر دی کہ یہ خط ابن زیاد کو پڑھ کر سنانا، اگر وہ حسین سے جنگ پر آمادہ ہو جائے تو خیر ورنہ تم ابن زیاد کو قتل کر کے فوج کی کمان خود اپنے ہاتھ میں لے لینا۔

ابن زیاد جانتا تھا کہ بہ صورت انکار اس کا کیا حشر ہوگا۔ اس لئے اس نے حسین سے بیعت اور ہتھیار ڈالنے کا مطالبہ کیا۔ اور جب انھوں نے اس سے انکار کیا تو لڑائی شروع ہوئی اور حسین شہید ہوگئے (۱۰ محرم ۶۱ھ۔ ۱۰ اکتوبر ۶۸۰ء)

اس اجمالی جائزہ سے آپ کو معلوم ہوگیا کہ حضرت عمر کے زمانے میں مسلمانوں کا سیاسی موقف کیا تھا ــــ عثمان کے زمانے میں کیا تبدیلیاں ہوئیں۔ شہادت عثمان کے بعد حضرت علی کن دشواریوں میں مبتلا ہوئے۔ معاویہ نے حسن سے صلح کر کے کس طرح اپنا راستہ صاف کر لیا اور حسین نے کن حالات کے تحت یزید کے خلاف خروج کیا۔

اب آئیے اس تمام تاریخی پس منظر کو سامنے رکھ کر مولانا عباسی کے دعاوی پر غور کریں۔

(۱) مولانا عباسی کا یہ خیال کہ قتل عثمان سے لیکر شہادت علی تک تمام قتل و فساد کی ذمہ داری عبداللہ بن سبا اور سبائی جماعت پر عائد ہوتی ہے۔ میری رائے میں درست نہیں۔ کہا جاتا ہے کہ عبداللہ بن سبا (ابن السوداء) صنعاء کا ایک یہودی تھا جو عثمان کے عہد میں مسلمان ہوا لیکن اس کا اسلام

منافقانہ تھا۔ چنانچہ جب وہ حجاز، بصرہ، کوفہ ہوتا ہوا مصر پہنچا تو مخالفین عثمان کی جماعت میں شامل ہو کر مدینہ آیا اور جیسا کہ عباسی صاحب نے ظاہر کیا ہے۔ جب حضرت علی طالبین قصاص کے مقابلہ کے لئے بصرہ گئے تو یہ بھی اپنی پارٹی کے ساتھ ساتھ تھا، اور جنگ صفین میں جب قرآن کے ذریعہ فیصلہ کا مطالبہ حضرت علی نے مان لیا تو یہ اپنی تمام پارٹی کے ساتھ علی کا مخالف ہو گیا اور سخت فتنہ و فساد کا باعث ہوا۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ ابن السوداء (اگر واقعی اس کا کوئی وجود تھا) حضرت علی کے ساتھ بصرہ نہیں گیا، مورخین نے جنگ صفین کے سلسلہ میں اس کا کہیں ذکر نہیں کیا اس کی جماعت کے بعض افراد ضرور علی کے ساتھ گئے۔ لیکن ان میں سے اکثر نے آخیر وقت تک آپ کا اتباع کیا۔ رفع مصحف کے وقت البتہ ان میں سے چند افراد خوارج کے ساتھ مل گئے۔ لیکن ابن السوداء کا ذکر نہ جنگ صفین کے سلسلہ میں کہیں نظر آتا ہے اور نہ خوارج کے سلسلہ میں۔

بلاذری نے حضرت عثمان اور حضرت علی کے ذکر میں کسی جگہ ابن السوداء کا نام نہیں لیا۔ طبری اور اس کے بعد کے مورخین نے البتہ ایام عثمان و علی میں اس کا ذکر کیا ہے۔ لیکن اس کے بعد پھر اس کا نام کہیں نظر نہیں آتا۔ اور اسی بنا پر ڈاکٹر طٰہٰ حسین نے لکھا ہے کہ :-

ابن السوداء لم یکن الّا وھماً وان وُجد بالفعل فلم یکن ذا خطر کالذی صورہٗ المورخون نشاءتہ	ابن السوداء وہم ہی وہم تھا اور اگر اس کا وجود تھا بھی تو وہ ایسا خطرناک نہ تھا، جیسا کہ مورخین نے ایام عثمان اور خلافت

ایام عثمان وفی العام الاول من خلافۃ علی۔	علی کے پہلے سال کے ذکر میں ظاہر کیا ہے۔

معلوم ایسا ہوتا ہے کہ ابن السوداء کا وجود اہل تشیع کے مخالفین کا پیدا کیا ہوا تھا اور اس سے مقصود یہ تھا کہ شیعیت میں عنصر یہودیت کا شمول ظاہر کر کے اُسے مطعون کیا جائے۔

(۲) دوسرا مسئلہ اور غالباً سب سے زیادہ اہم مسئلہ یزید کی جانشینی کا ہے، لیکن اس پر گفتگو کرنے سے پہلے یہ جان لینا ضروری ہے کہ اس عہد میں منصب خلافت کو کس نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔

اسلام کی ابتدائی تاریخ کے مطالعہ سے یہ بات ثابت ہے کہ صدر اسلام میں خلافت کو خاندانی یا موروثی حق سمجھنا بہت برا خیال کیا جاتا تھا۔ رسول اللہؐ نے کسی کو اپنا خلیفہ نامزد نہیں کیا[1]۔ حضرت عمرؓ نے باوجود اس کے کہ لوگوں نے آپ سے اصرار کیا کہ اپنے بعد اپنے بیٹے عبداللہ کو خلیفہ نامزد کر دیں، لیکن

---

[1] حضرات شیعہ کا خیال ہے کہ حجۃ الوداع کے وقت رسول اللہ کا یہ ارشاد کہ من کنت مولاہ فعلیٌّ مولاہ "یا یہ کہ" میری اور علی کی نسبت ہارون و موسیٰ کی سی ہے" یہی معنی رکھتا ہے کہ رسول اللہ نے اپنے بعد حضرت علی کو اپنا خلیفہ یا جانشین مقرر کر دیا تھا اور اس کی تائید میں وہ واقدی قرطاس کو بھی پیش کرتے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ رسول اللہ کا ذاتی رجحان یہی رہا ہو کہ میرے بعد حضرت علی خلیفہ ہوں لیکن آپ کا یہ رجحان کوئی الہامی فیصلہ نہ تھا اور قرآن کی کسی آیت سے اس کی تائید نہیں ہوتی۔ رسول اللہؐ اگر اپنے مرض موت میں کاغذ و قلم طلب کر سکتے تھے تو وہ ایک فقرہ بھی نہایت آسانی سے کہہ سکتے تھے کہ "میرے بعد علی جانشین ہوں گے" لیکن آپ نے ایسا نہیں کیا کیونکہ اس قسم کی وحی آپ پر نازل نہیں ہوئی تھی اور بات آپ کی ذاتی پسندیدگی کی حد سے آگے نہ بڑھی۔

اُنھوں نے نہیں مانا اور مسئلہ مجلس شوریٰ پر چھوڑ دیا ـــــ اسی طرح حضرت عثمان کے ذہن میں بھی یہ بات کبھی نہیں آئی کہ کسی کو اپنا جانشین نامزد کر دیں۔ اگر یہ کہا جائے کہ حضرت عثمان اچانک قتل ہوئے اور ان کو اس کی مہلت ہی نہ ملی تو یہ کہنا غلط ہوگا کیونکہ وہ بارہ سال تک خلیفہ رہے اور اس زمانے میں اگر وہ چاہتے تو کسی کو اپنا جانشین نامزد کر سکتے تھے۔ حضرت علی نے بھی استخلاف سے انکار کیا اور جب صحابہ نے ان سے پوچھا تو انھوں نے فرمایا "اترککم کما ترککم رسول اللہ" یعنی جس طرح رسول اللہ نے کسی کو اپنا خلیفہ نہیں بنایا، میں بھی نہیں بنانا چاہتا۔ لوگوں نے پھر پوچھا کہ کیا آپ کے بعد ہم حسن کے ہاتھ پر بیعت کریں تو آپ نے فرمایا کہ "لا آمرکم ولا انھاکم" نہ میں اس کا حکم دیتا ہوں اور نہ باز رکھتا ہوں۔

بہرحال صدر اوّل کے مسلمان وراثتِ خلافت کو بہت برا سمجھتے تھے۔ کیونکہ وہ اکاسرہ و قیاصرہ کی تقلید تھی۔ لیکن معاویہ نے اس کی مطلق پروا نہیں کی ـــــ حضرت علی کے انتقال کے بعد معاویہ اور حسن کے درمیان دوبار عہد نامہ ہوا پہلے عہد نامہ میں حسن نے یہ شرط رکھی تھی کہ معاویہ کے بعد خلافت ان کی طرف منتقل ہوگی اور معاویہ نے اسے تسلیم کر لیا تھا۔ دوسرے عہد نامہ میں حسن نے ولی عہدی کے مسئلہ کو شوریٰ پر چھوڑ دیا اور خود اپنی ولی عہدی کا کوئی ذکر اس میں نہیں کیا۔ معاویہ نے اس کو بھی تسلیم کر لیا۔ اس لئے معاویہ پر یہ الزام تو قائم نہیں ہو سکتا کہ انھوں نے اپنے بعد حسن کی خلافت کو تسلیم کر لینے کے باوجود یزید کی خلافت کی کوشش کی۔ کیونکہ دوسرے عہد نامہ کی رو سے پہلا عہد نامہ منسوخ ہو چکا تھا، لیکن امیر معاویہ پر دوسرے عہد نامہ کی خلاف ورزی کا الزام اس اعتبار سے

ضرور قائم کیا جا سکتا ہے کہ انھوں نے اپنی زندگی ہی میں اپنے بیٹے کی خلافت کی کوشش کی۔ حالانکہ طے یہ پایا تھا کہ معاویہ اپنی زندگی میں نہیں بلکہ اپنے مرنے کے بعد جانشینی کے مسئلے کو شوریٰ پر چھوڑ دیں گے۔ ہر چند اس نامزدگی کے لئے انھوں نے رسماً یہ ضرور کیا کہ مختلف صوبوں کے وفود طلب کر کے ان کے سامنے اس مسئلہ کو پیش کیا اور ان کی رضامندی حاصل کی۔ لیکن اس کا ایک سبب یہ تھا کہ امیر معاویہ ایسا چاہتے تھے۔ اور ان کی رائے سے اختلاف کی جرأت کس کو ہو سکتی تھی۔ تمام عمال اچھی طرح سمجھتے تھے کہ امیر معاویہ کی خواہش کے خلاف قدم اٹھانا امارت و سیادت کو ہاتھ سے کھو دینا ہے۔ اس لئے جتنے وفود نے یزید کی نامزدگی کی تقریب میں شرکت کی ان کی رائے پہلے سے خریدی جا چکی تھی۔ دوسرا سبب یہ تھا کہ اس وقت اکثر صوبے امویین کے زیر اقتدار تھے اور وہاں کے عمال سمجھتے تھے کہ یزید کا زمانہ ان کے لئے اور زیادہ سازگار ثابت ہوگا۔

بہر حال اس میں شک نہیں کہ جہاں جہاں اموی اثرات قائم تھے، وہاں وفود نے یزید کی جانشینی کے حق میں رائے دے دی۔ لیکن حجاز بالکل علیحدہ رہا۔ پھر چونکہ امیر معاویہ جانتے تھے کہ جب تک اہل حجاز کی رائے نہ حاصل کر لی جائے نامزدگی کی کارروائی مکمل نہیں ہو سکتی۔ اس لئے وہ خود وہاں گئے اور تخویف وطمع سے بعض اکابر قریش کو راضی کر لیا لیکن حسین۔ عبداللہ بن زبیر، عبداللہ بن عمر اور عبدالرحمن بن ابی بکر آخیر وقت تک اس نامزدگی کے مخالف رہے اور انھوں نے یزید کی جانشینی کو تسلیم نہیں کیا۔

اگر یہ کہا جائے کہ جب اور تمام صوبوں نے اس نامزدگی کو تسلیم کر لیا

تھا یہاں تک کہ اکثر اکابر حجاز نے بھی تو پھر چند نفوس کے انکار سے کیا ہو سکتا ہے۔ اکثریت تو یزید ہی کے حق میں تھی۔ لیکن بایں ہمہ اس سے انکار ممکن نہیں کہ امیر معاویہ کا یہ طرز عمل ایک ایسی بدعت تھی جس نے اصولِ خلافت ہی کو سرے سے بدل دیا اور خلافت وراثتاً منتقل ہونے لگی۔ ممکن ہے بعض حضرات (جن میں عباسی صاحب بھی شامل ہیں) امیر معاویہ کے اس اقدام کو جائز قرار دیں۔ لیکن مستحسن وہ بھی نہیں کہہ سکتے۔ صحیح طریق کار یہ تھا کہ امیر معاویہ اپنی زندگی میں بالکل خاموش رہتے اور اپنی جانشینی کے مسئلہ کو مجلس شوریٰ کے سپرد کر جاتے (جس کا انھوں نے عہد کیا تھا) لیکن انھوں نے ایسا نہیں کیا۔ کیونکہ ان کی خلافت خلفاء راشدین کی سی نہ تھی بلکہ اکاسرہ قیاصرہ کی سی امارت و حکومت تھی۔ جسے انھوں نے بزورِ شمشیر حاصل کیا تھا اور انہی اکاسرہ و قیاصرہ کی سنّت کے مطابق وہ اُسے اپنے خاندان سے باہر جانے دینا پسند نہ کرتے تھے۔ اس لیے ان کا یزید کو اپنی زندگی ہی میں اپنا جانشین نامزد کرنا دنیاوی حکمراں کی حیثیت سے تو کوئی نئی بات نہ تھی۔ لیکن خلیفۃ المسلمین کی حیثیت سے ان کا یہ عمل (منصب خلافت کی روایاتِ سابقہ کے پیشِ نظر یقیناً نادرست تھا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اسلامی حکومت دنیاوی حکومت میں تبدیل ہو گئی۔ جاہ و اقتدار کے لئے آپس ہی میں لڑائیاں شروع ہو گئیں اور جامعۂ اسلامی میں اختلال و انتشار پیدا ہو کر اس کی سالمیت ہمیشہ کے لیے ختم ہو گئی۔

اس میں شک نہیں کہ امیر معاویہ کا نام اکابر صحابہ میں شمار ہوتا تھا۔ کاتبِ

وحی ہونے کی خدمت بھی اُنھوں نے انجام دی تھی۔ حضرت عمر کی صحبت میں ان کی جاہلیت کی ذہنیت بہت کچھ بدل گئی تھی لیکن تھے وہ بہرحال اس باپ (ابوسفیان) کے بیٹے (جو اُحد و خندق میں رسول اللہ سے سخت معاندانہ لڑائی لڑے) اور اُس ماں (ہند) کے فرزند جس نے حمزہ کا کلیجہ چبا کر اپنا جذبۂ انتقام فرو کیا۔ پھر یوں بھی وہ اس قریشی خاندان کے فرد تھے جو عہد جاہلیت میں اپنی سنگ دلی۔ درشت مزاجی اور انتقام پسندی کے لحاظ سے کافی بدنام تھا۔ اس لئے کوئی وجہ نہ تھی کہ امیر معاویہ ان خاندانی خصوصیات سے بالکل محروم رہتے۔ چنانچہ تاریخ سے ظاہر ہوتا ہے کہ انھوں نے اپنے مقاصد کی تکمیل میں ہر ممکن سختی سے کام لیا اور کسی عہد و پیمان کی بھی پروا نہ کی۔

حسن سے دو عہد کئے تھے۔ ایک یہ کہ وہ اپنے بعد کسی کو اپنا جانشین نامزد نہ کریں گے، لیکن کیا ——— دوسرے یہ کہ وہ علویین کے خلاف کسی انتقامی جذبہ سے کام نہ لیں گے، لیکن اس عہد کو بھی توڑا اور محض شک و شبہ پر سیکڑوں علویین کو تہِ تیغ کر دیا۔ یہاں تک کہ حجر بن عدی ایسے عظیم المرتبت صحابی و مجاہد بھی ان کے ہاتھ سے نہ بچ سکے۔ اور یہ ایسا دلدوز واقعہ تھا کہ خود ان کے افراد خاندان نے بھی اسے صد درجہ قابلِ اعتراض قرار دیا۔ چنانچہ بلاذری نے لکھا ہے کہ "معاویہ نے ایک دن نماز کو بہت طول دیا تو ان کی بیوی نے کہا" ما احسن صلاتك يا امير المومنين لولا انك قتلت حجرا واصحابه" (اے امیر المومنین آپ کی نماز کتنی اچھی ہوتی اگر آپ نے حجرؓ اور ان کے ساتھیوں کو ہلاک نہ کیا ہوتا)

مورخین کا بیان ہے کہ خود معاویہ کی زندگی کی آخری ساعتیں بھی نہایت کرب و اضطراب میں گزریں کیونکہ ان کا ضمیر قتل حجر پر ان کو ملامت کر رہا تھا۔

پھر ان کی کامیابیوں کا سبب صرف یہ نہ تھا کہ وہ بڑے سخت گیر انسان تھے بلکہ وہ مدبر بھی اتنے ہی بڑے تھے اور فریق مخالف کو رام کرنے یا اس کے خطرات کو دور کرنے کے لیئے وہ بڑی سے بڑی فیاضی و مراعات سے دریغ نہ کرتے۔ چنانچہ حسن و حسین اور تمام اکابر علوئین کی امداد وہ اس لئے نہ کرتے تھے کہ انھیں اس کا مستحق سمجھتے تھے بلکہ صرف اس لیئے کہ وہ کوئی مخالفانہ قدم نہ اٹھائیں اور اس طرح اموی سلطنت کی جڑیں مضبوط ہوتی جائیں۔

ایک بار حضرت علی کے بھائی، عقیل بن ابی طالب نے علی سے کچھ امداد چاہی۔ آپ نے حسن سے مخاطب ہو کر کہا کہ "اپنے چچا کے ساتھ بازار جاؤ اور انھیں ایک جوڑا کپڑا اور جوتا خرید دو۔ اس سے زیادہ کچھ نہیں"۔ اس کے بعد جب عقیل امیر معاویہ کے پاس گئے تو انھوں نے ایک لاکھ درہم بیت المال سے نکال کر دے دیئے۔

خلفائے راشدین میں سے کسی نے خلافت تلوار سے حاصل نہیں کی۔ اور نہ اُسے اپنی اولاد میں منتقل کیا۔ لیکن معاویہ نے خلافت تلوار سے حاصل کی۔ بیت المال کو لٹا کر حاصل کی۔ اور اپنے بیٹے یزید کو ولیعہد بنا کر خلافتِ اسلامی کی روح کو ہمیشہ کے لئے فنا کر دیا۔ امیر معاویہ بیت المال کو مسلمانوں کا مال نہ سمجھتے تھے بلکہ اپنی مقصد برآری کے لئے جس طرح چاہتے

صرف کرتے تھے۔ ایک بار جب صعصعۃ ابن سوجانی نے اعتراض کیا تو امیر معاویہ نے کڑک کر کہا کہ:۔

"الارض للہ وانا خلیفۃ اللہ فما اخذت فی وما ترکت للناس فبالفضل منی"

(زمین خدا کی ہے اور میں خدا کا نائب ہوں، جو کچھ میں لیتا ہوں وہ میرا ہے۔ اور جو میں لوگوں کے لیے چھوڑ دیتا ہوں وہ محض میری مہربانی ہے")

بعد کو یزید نے بھی اسی پالیسی پر عمل کیا۔ ایک بار عبداللہ بن جعفر یزید کے پاس گئے تو یزید نے پوچھا کہ میرے باپ کے زمانے میں آپ کو کتنا وظیفہ ملتا تھا، بولے "دس لاکھ درہم" یزید نے کہا میں دو چند کئے دیتا ہوں" عبداللہ بن جعفر نے کہا کہ "اس سے قبل میں نے کسی سے نہیں کہا تھا کہ میری تنخواہ اتنی کم ہے"۔ یہ سن کر یزید نے کہا "میں اس کو چار چند کئے دیتا ہوں"۔ یہ سن کر بعض نے اعتراض کیا تو یزید نے کہا کہ یہ رقم ایک شخص کو نہیں بلکہ سارے مدینہ کو دی گئی ہے (عقد الفرید)

امیر معاویہ اور آپ کے جانشینوں کے اسی بیجا اسراف کا نتیجہ تھا کہ انھیں ہمیشہ روپیہ کی شدید ضرورت رہتی تھی اور وہ گورنروں کو حکم لکھدیا کرتے تھے کہ جس طرح ممکن ہو اتنا روپیہ بھیجدیا جائے اور بے چون وچرا اس کی تعمیل ہوتی تھی۔ نہ صرف اس لئے کہ ان کی گورنری کا انحصار اس پر تھا بلکہ اس لئے بھی کہ اس طرح انھیں خود بھی لوٹ مار اور عیش وعشرت کی زندگی بسر کرنے کا موقع ہاتھ آجاتا تھا۔ جو اکابر بنی امیہ کے معاشرت کا جزو بن گئی تھی۔ برخلاف اس کے حضرت عمر کے زمانے کو

دیکھیے۔ جب بیت المال تمام مسلمانوں کی ملکیت سمجھا جاتا تھا اور ممکن نہ تھا کہ خلیفہ یا گورنر مقررہ رقم سے ایک پیسہ زیادہ لے سکے، حضرت ابوبکر کا وصال ہوا تو آپ کے پاس صرف ایک دینار تھا، حضرت عمرؓ کو ضرورت ہوتی تو بیت المال سے قرض لیتے اور ایک ایک درہم واپس کر دیتے حضرت علیؓ کی عسرت کا یہ عالم کہ صرف ایک کرتہ جسم پر ہوتا اور آپ سردی سے کانپنے لگتے۔ انکسار کا یہ عالم تھا کہ ایک بار آپ کچھ کھجوریں لیے جا رہے تھے، لوگوں نے کہا کہ ہمیں دے دیجیے ہم پہنچا دیں۔ لیکن آپ نے اسے قبول نہ کیا۔

اس میں شک نہیں کہ اس غیر جمہوری و غیر اسلامی انقلاب کی بنیاد حضرت عثمان کے زمانے میں پڑی جو فطرتاً بڑے فیاض تھے۔ اور جن کی غیر معمولی داد و دہش کی بدولت ملک کی حالت اس وقت یہ تھی کہ نہ صرف حجاز بلکہ عراق وغیرہ تمام بلاد عرب میں صحابہ بڑی بڑی جائدادوں کے مالک ہو گئے تھے۔ محلات و قصور تعمیر ہو رہے تھے، نغمہ و سرود کا میلان بڑھ رہا تھا۔ خوبصورت کنیزیں گرد و پیش رہتی تھیں چھوٹی چھوٹی املاک ختم ہوتی جا رہی تھیں اور اس طرح ایک نیا طبقہ بڑے بڑے صاحب املاک جاگیرداروں کا پیدا ہو رہا تھا۔ جو اپنے اپنے علاقوں میں خود مختارانہ حیثیت رکھتے تھے۔ اور جن میں طلحہ، زبیر اور مروان ابن الحکم وغیرہ ایسے مقدس حضرات بھی شامل تھے۔

الغرض اس زمانے میں اسلام کے اندر ایک نیا طبقہ پیدا ہو رہا تھا

جس نے اسلام کی جمہوریت پسندی کو ختم کرکے اسے حکومتِ امراء ——— (ارسٹاکریسی) میں تبدیل کر دیا۔ اور یہ تھا وہ ماحول جس میں یزید کی پرورش ہوئی۔ یہ تھی وہ فضا جس میں وہ پروان چڑھا۔ لیکن پھر بھی مولانا عباسی مُصر ہیں کہ وہ بڑا زاہد و متقی، بڑا پابند شریعت اور نہایت پاکیزہ اطوار کا انسان تھا۔

اس میں شک نہیں کہ انھوں نے اپنے اس دعوے کے ثبوت میں بعض مورخین کی روایات بھی پیش کی ہیں لیکن اس کا کیا علاج کہ جس طرح تاریخ میں یزید کے زہد و ورع کے روائیتیں ملتی ہیں۔ بالکل اسی طرح کی بلکہ اس سے زیادہ اس کے لہو و لعب، عیش و عشرت، مے نوشی اور فسق و فجور کا ذکر بھی مورخین نے کیا ہے، چنانچہ مسعودی لکھتا ہے کہ "یزید اپنے وقت کا زیادہ حصّہ سیر و شکار میں بسر کرتا تھا، شراب کا بھی سخت عادی تھا۔ اسی کے عہد میں موسیقی کا رواج حرمین میں شروع ہوا۔ جس سے اس وقت تک مسلمان ناآشنا تھے۔"

مغربی مورخین میں فرانسیسی لامنس نے بے شک یزید کی بہت تعریف کی ہے اور عباسی صاحب نے اس کا حوالہ بھی اپنی کتاب میں دیا ہے۔ لیکن لامنس کی یہ کتاب قابلِ اعتبار نہیں کیونکہ اس کا ماخذ تمام وہی روایات ہیں جو امویین کے زیرِ اثر گھڑلی گئی تھیں اس لئے ہم کو روایات کے انبار سے قطع نظر محض درایت و نفسیات کو سامنے رکھ کر صحیح و غلط کا فیصلہ کرنا چاہئیے اور یہ فیصلہ اس کے سوا کچھ نہیں ہو سکتا کہ جس ماحول میں یزید

نے پرورش پائی تھی اس کا تقاضا یہی تھا کہ وہ ایک رند مشرب ظالم وجابر حکمراں بنتا نہ کہ تہجد گزار متقی و پرہیزگار انسان، جیسا عباسی صاحب نے ظاہر کیا ہے۔

اب رہا مسئلہ یزید کی جانشینی کا جس کی بابت مولانا عباسی لکھتے ہیں کہ اس پر سارا ملک متفق تھا۔ سو مجھے اس سے بھی اختلاف ہے۔

جب معاویہ نے یزید کو نامزد کیا تو ایک سرخ خیمہ میں اس کو اپنے پاس بٹھایا اور یہ معلوم کرنے کے لئے کہ دیکھیں مسلمانوں کا کیا خیال ہے اور وہ اظہار اطاعت کے لئے آتے ہیں یا نہیں۔ ایک شخص کو سامنے بلایا اور اس نے باپ بیٹے دونوں کو سلام کرکے کہا "اے امیر المومنین اگر آپ یزید کو اپنا جانشین مقرر نہ کرتے تو اسلام تباہ ہوجاتا" اس وقت احنف بن قیس التمیمی بھی موجود تھے۔ معاویہ نے پوچھا "تم کیوں خاموش ہو" احنف نے جواب دیا "جھوٹ بولوں تو خدا سے ڈر لگتا ہے اور سچ بولنے پر تم سے ڈرتا ہوں" معاویہ نے یہ سن کر کہا "خدا تمھیں اس اطاعت کا اجر دے" اور حکم دیا کہ احنف کو انعام دیا جائے۔ اس سے نہ صرف یہ ظاہر ہوتا ہے کہ یزید کی جانشینی کو سب لوگ اچھا نہ جانتے تھے بلکہ یہ بھی کہ لوگوں کی رضامندی حاصل کرنے کیلئے کن کن تدابیر سے کام لیا گیا۔ رہے وہ صوبے جو اموی گورنروں کے زیر اثر تھے ان کو یزید کی جانشینی پر اتفاق کرنا ہی تھا "سروں پر تلوار تھی اور معاملہ" وے بر ندش "کا تھا۔ لیکن دوسرے مقامات پر جو معاویہ کے زیر اثر نہ تھے۔ بیعت حاصل نہ ہوسکی چنانچہ نامزدگی

یزید کے وقت (۶۸۰ء) چار شخص اور دعویدار خلافت موجود تھے جنھوں نے یزید کی جانشینی کو تسلیم نہ کیا تھا۔ اس لئے یہ کہنا کہ یزید کی نامزدگی تمام بلاد عرب کی آزادانہ رائے سے ہوئی تھی۔ یقیناً صحیح نہیں۔ اور اگر حسین نے یزید کو ایک غیر مستحق غاصب خلیفہ سمجھ کر اس کے خلاف خروج کیا تو ان کا یہ فعل قطعاً ناجائز نہیں تھا گو اس وقت کے سیاسی حالات کے پیش نظر مناسب نہ رہا ہو۔

خروج حسین اور واقعہ کربلا کے سلسلے میں مولانا عباسی کا یہ خیال کہ کوفہ والوں کا انحراف مسلم بن عقیل اور حسین سے صرف اس لئے تھا کہ ابن زیاد نے ان پر یہ ثابت کر دیا تھا کہ یزید جائز خلیفہ وقت ہے اور خلیفہ کے خلاف خروج جائز نہیں۔ میری رائے میں درست نہیں۔ بلکہ اس کا سبب بھی وہی امویین کی عسکری قوت تھی جس کا مقابلہ اہل کوفہ کیا خود مکہ و مدینہ والے بھی نہ کر سکتے تھے۔ چنانچہ جب حسین نے کوفہ کا قصد کیا تو آپ کے بعض بزرگوں اور خصوصیت کے ساتھ ابن عباس نے کہا کہ "تم یہ کیا کر رہے ہو" لیکن آپ نہیں مانے۔ کیونکہ انھیں اہل کوفہ کی اعانت پر اعتماد تھا اور انھیں یقین تھا کہ ازکم کوفہ پر تو ان کا قبضہ ہو ہی جائے گا اور پھر اسے مرکز خلافت قرار دے کر آگے بڑھیں گے لیکن کوفہ والوں کی غیر وفاداری اور مسلم بن عقیل کے قتل کا علم انھیں اس وقت ہوا جب وہ کوفہ کے قریب پہنچ چکے اور عبید اللہ ابن زیاد نے

(جسے یزید نے نعمان بن بشیر کی جگہ اسی غرض سے کوفہ کا حاکم بنایا تھا) ان کے لئے تمام راہیں بند کر دی تھیں۔

ظاہر ہے کہ حسین کے سامنے اس وقت جنگ کا کوئی سوال نہ ہو سکتا تھا۔ وہ اچھی طرح سمجھتے تھے کہ ان حالات میں جبکہ ہزاروں کا لشکر ان کو گھیرے ہوئے ہے، مقابلہ کرنا جان بوجھ کر اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈالنا ہے اسی لئے انھوں ابن زیاد سے کہہ دیا کہ میں تم سے جنگ کرنا نہیں چاہتا۔ بلکہ حجاز واپس جانا چاہتا ہوں۔ اور اگر تم کو یہ منظور نہ ہو تو پھر مجھے ان جیوش اسلامی سے مل جانے دو جو سرحدی علاقوں میں دشمنان اسلام سے برسرپیکار ہیں یا پھر مجھے دمشق جانے دو تاکہ میں خود یزید سے مل کر گفتگو کروں۔ اس آخری شرط کے الفاظ بعض مورخین نے یہ لکھے ہیں "ان اضع یدی فی یدہ" یعنی مجھے دمشق جانے دو تاکہ میں یزید کے ہاتھ میں اپنا ہاتھ دے دوں۔ اور اگر اس کو صحیح سمجھ لیا جائے تو پھر یہ روایت صحیح ماننا پڑیگی کہ ابن زیاد نے حسین سے یہ الفاظ سننے کے بعد کہا کہ "یزید کی بیعت تم میرے ہاتھ پر بھی کر سکتے ہو" لیکن حسین نے اسے منظور نہیں کیا۔

میں سمجھتا ہوں کہ حسین نے ابن زیاد سے یہ کبھی نہ کہا ہوگا کہ "میں یزید کے ہاتھ پر بیعت کر لوں گا" بلکہ صرف یہ کہا ہوگا کہ "مجھے دمشق یزید کے پاس جانے دو اور پھر وہاں جیسا ہوگا ہو جائے گا" (یکون مایکون)

اس روایت کو تسلیم نہ کرنے کے کئی اسباب ہیں، ایک یہ کہ اگر حسین یزید کی بیعت مناسب سمجھتے تو وہ خروج ہی کیوں کرتے۔ دوسرے یہ کہ اگر

انھوں نے ابن زیاد سے دمشق جاکر یزید کے ہاتھ پر بیعت کرنے پر رضامندی ظاہر کردی تھی تو وہ یقیناً ابن زیاد کے ہاتھ پر بیعت کر لیتے۔ کیونکہ اس کے معنے بھی یہی تھے گویا انھوں نے یزید کے ہاتھ پر بیعت کرلی۔

لیکن اگر یہ کہا جائے کہ حسین نے ڈر کر یہ بہانہ جان بچانے کا ڈھونڈھا تھا تو کیا وہی خوف انھیں ابن زیاد کی بیعت کرنے پر مجبور نہ کرسکتا تھا جبکہ وہ سمجھتے تھے کہ بصورت انکار نتیجہ ہلاکت کے سوا کچھ نہیں۔ علاوہ اس کے سب سے بڑا سبب اس روایت کے غلط قرار دینے کا یہ ہے کہ حسین کا کردار ہی یہ نہ تھا کہ وہ کسی خوف سے اپنے ضمیر کے خلاف کوئی بات کہیں۔

کہا جاتا ہے کہ ابن زیاد حسین کی شرطیں سن کر کچھ نرم پڑ گیا تھا لیکن شمر بن ذی الجوشن نے ابن زیاد کو سمجھایا کہ دیکھو اس موقع کو ہاتھ سے نہ جانے دو۔ ورنہ اگر حسین کو چھوڑ دیا تو کل وہ پھر خروج کریں گے اور لوگ ان کا ساتھ دیں گے۔ یہ بات ابن زیاد کی سمجھ میں آگئی۔ اور پھر اس نے وہی کیا جو ایک پست فطرت انسان کرسکتا ہے۔ اس کی جگہ اگر کوئی دوسرا مردانہ خصائل رکھنے والا انسان ہوتا وہ کبھی گوارا نہ کرتا کہ ہزاروں کا لشکر لے کر ۷۲ نفوس کے مقابلہ میں آئے اور تمام عمر کے لئے اپنی بزدلی و کمینگی پر مہر دوام ثبت کر جائے۔

پھر اس واقعہ کے سلسلہ میں لڑائی کے جو تفصیلی واقعات بیان کئے جاتے ہیں وہ ممکن ہے مبالغہ سے خالی نہ ہوں اور واقعیت سے کچھ دور ہوں۔ لیکن اس سے انکار ممکن نہیں کہ قتل حسین کے بعد اس نے یقیناً آپ کے جسد مبارک کی بے حرمتی کی۔ آپ کے سر کو نیزہ پر بلند کیا۔ اور پھر یزید کے پاس

بھیج دیا۔ کیونکہ امویین کے زمانہ میں دشمنوں کے سروں کو تمام ملک میں مشتہر کرنا عام دستور ہو گیا تھا اور اس کی ابتدا عمرو بن الحمق الخزاعی کے سر سے ہوئی تھی۔ جو شہادت عثمان کے الزام میں قتل کیا گیا تھا۔

اس سلسلہ میں ایک عجیب و غریب واقعہ جسے ابن خلکان نے بیان کیا ہے۔ سننے کے قابل ہے :۔

"جب مصعب ابن زبیر کا سر عبدالملک اموی کے سامنے لایا گیا تو وہ کوفہ میں اپنے بالاخانہ پر بیٹھا تھا۔ ابن عمیر بھی وہیں موجود تھے۔ یہ دیکھ کر وہ کانپ اٹھے۔ عبدالملک نے اس کا سبب دریافت کیا تو انھوں نے کہا کہ اللہ محفوظ رکھے۔ میں اسی بالاخانہ پر عبید اللہ ابن زیاد کے ساتھ بیٹھا تھا کہ حسین کا سر اسی طرح لایا گیا۔ اس کے بعد میں مختار ابن ابی عبیدہ کے ساتھ یہیں بیٹھا تھا کہ عبداللہ بن زیاد کا سر اسی طرح پیش کیا گیا۔ اس کے بعد مصعب ابن زبیر کے ساتھ بیٹھا تھا کہ مختار ابن ابی عبیدہ کا سر اسی طرح لایا گیا۔ عبدالملک یہ سُن کر خوفزدہ ہو گیا اور اس نے اس بالاخانہ کو منہدم کرا دیا۔"

اس سے نہ صرف یہ ثابت ہوتا ہے کہ امویین کے زمانے میں سروں کی تشہیر کرنا عام دستور تھا۔ بلکہ یہ بھی کہ واقعۂ کربلا کے بعد حسین کے سر کی بھی اسی طرح تشہیر کی گئی اور وہ تمام بے حرمتیاں روا رکھی گئیں جن کا ذکر تاریخ کی کتابوں میں پایا جاتا ہے۔

اس سلسلہ میں یہ بھی کہا جاتا ہے کہ یزید نہیں چاہتا تھا کہ حسین کو قتل کر دیا جائے۔ اور ابن زیاد نے یہ حرکت یزید کی مرضی کے خلاف کی تھی لیکن یہ

بات میری سمجھ میں نہیں آتی کیونکہ اگر ابن زیاد نے یہ سب کچھ یزید کی مرضی کے خلاف کیا تھا تو چاہئے تھا کہ یزید اس سے باز پرس کرتا۔ اس کی سرزنش کرتا۔ لیکن اس نے ایسا نہیں کیا بلکہ اس کی عزت و توقیر میں اور اضافہ ہو گیا۔ حقیقت یہ ہے کہ یزید خود چاہتا تھا کہ حسینؑ کا کانٹا ہمیشہ کے لئے اس کی راہ سے ہٹ جائے کیونکہ وہ جانتا تھا کہ آج نہیں تو کل ضرور حسینؑ اس کے خلاف خروج کریں گے اور اس کی حکومت متزلزل ہو جائے گی۔

پھر اس کو چھوڑیئے کہ حسینؑ رسول اللہ کے نواسے اور علیؑ کے فرزند تھے کیونکہ امور دین میں محض نسبی بلندی اور وراثتی استحقاق کوئی چیز نہیں۔ اصل چیز ذاتی کیرکٹر اور فطری صلاحیت ہے۔ اور اسی کو سامنے رکھ کر عباسی صاحب کو اپنی رائے قائم کرنا تھی، لیکن انھوں نے ایسا نہیں کیا۔

کیا میں ان سے پوچھ سکتا ہوں کہ اگر حسینؑ و یزید میں سے کسی ایک کی خلافت کی بابت ان کی رائے طلب کی جاتی تو کیا وہ یزید کے حق میں رائے دے دیتے۔ کیا وہ حسینؑ سے کٹ کر یزید کے ہاتھ میں ہاتھ دے دیتے یقیناً وہ ایسا نہ کرتے۔ کیونکہ جس حد تک خالص اسلامی زندگی کا تعلق ہے حسینؑ بالیقین یزید سے بدرجہا بہتر مسلمان تھے جس سے ان کو بھی انکار نہ ہوگا۔ اور یہیں سے یہ بات صاف ہو جاتی ہے کہ معاویہ کے بعد بہ نسبت یزید کے حسینؑ زیادہ مستحق خلافت تھے اور اگر حسینؑ نے خلافت یزید کو تسلیم نہیں کیا تو یہ ان کے ضمیر کی صداقت و جرأت تھی اور اس کے خلاف ان کا خروج اسلامی فرض تھا جسے انھوں نے پورا کیا اور اس طرح پورا کیا کہ اس کی دوسری مثال

تاریخ اسلام میں ہم کو نہیں ملتی۔

عباسی صاحب نے اپنی کتاب میں یہ بھی ظاہر کیا ہے حضرت علی کا عہد خلافت بڑا ناکام عہد خلافت تھا اور ان کے لب و لہجہ سے مترشح ہوتا ہے کہ اس ناکامی کا سبب یہ تھا کہ علی خلافت کے لیے کچھ موزوں نہ تھے اور انھوں نے جو سخت گیر پالیسی اختیار کی وہ صحیح نہ تھی۔ اس پر غور کرنے کے لیے ضروری ہے کہ پہلے اس وقت کے حالات کو پیش نظر رکھا جائے۔

حضرت عثمان کے قتل کے بعد (جیسا کہ ہم پہلے ظاہر کر چکے ہیں) حضرت علی منصب خلافت سنبھالنے پر بہت متردد تھے اور مجبوراً لوگوں کے انتہائی اصرار پر آپ نے خلیفہ بننا منظور کیا۔ کیونکہ آپ جانتے تھے کہ امویین اکثر حصۂ ملک پر چھائے ہوئے ہیں۔ اور تعلیم اسلام کے بالکل منافی ایک ایسا دور حکومت شروع ہو گیا ہے جس کا مقصود زیادہ تر بربرد سختی سے دولت حاصل کر کے عیش و عشرت کی زندگی بسر کرنا ہے۔ اسی کے ساتھ آپ اس حقیقت سے بھی واقف تھے کہ شام اور تمام اطراف ملک میں امیر معاویہ کا زبردست اقتدار قائم ہو چکا ہے۔ جس کا مقابلہ آسان نہیں۔ کیونکہ امیر معاویہ کا طریق کار جس سے انھوں نے کامیابی حاصل کی (خود انھیں کے مطابق) یہ تھا کہ :-

"میں اپنی تلوار نہیں اٹھاتا۔ جب تک کوڑا کام دیتا ہے اور میں کوڑا نہیں اٹھاتا۔ جب تک میری زبان کام دیتی ہے۔ اگر میرے اور لوگوں کے درمیان صرف دھاگے کا سا رشتہ قائم ہو تو اسے بھی ٹوٹنے نہیں دیتا۔ کیونکہ جب

وہ اپنی طرف کھینچتے ہیں تو میں ڈھیلا چھوڑ دیتا ہوں اور جب
وہ ڈھیلا چھوڑ دیتے ہیں تو میں اپنی طرف کھینچ لیتا ہوں"

اور حضرت علی کے پاس صرف کوڑا تھا اور تلوار ـــــ ظاہر ہے کہ وہ لوگ جو امیر معاویہ کی داد و دہش کی بدولت شاہانہ زندگی بسر کرنے کے عادی ہو چکے تھے، نانِ جویں کھانے والے خلیفہ کی طرف کیونکر مائل ہو سکتے تھے لیکن آپ نے مطلق پرواہ نہیں کی اور فیصلہ کر لیا کہ نتیجہ خواہ کچھ ہو وہ اپنے ضمیر کے خلاف کوئی قدم نہ اٹھائیں گے۔ آپ سے لوگوں نے کہا بھی کہ فی الحال معاویہ کو اپنی جگہ رہنے دیجئے۔ لیکن آپ نے جواب دیا کہ خدا کی قسم میں دو دن معاویہ کو برسر اقتدار نہ رہنے دوں گا"

ظاہر ہے کہ امیر معاویہ کی طرف سے اس کا ایک ہی جواب ہو سکتا تھا وہ یہ کہ علی کی خلافت کو کامیاب نہ ہونے دیں۔ اور یہی انھوں نے کیا۔

اس مسئلہ میں بعض حضرات کی رائے یہ ہے کہ امیر معاویہ ایسے زبردست مدبر و سیاست داں کے مقابلہ میں علی کا ان کے خلاف قدم اٹھانا، مصالح سیاست کے خلاف اور فراست و دانائی سے دور تھا۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ حضرت علی نے جو کچھ کیا وہ نہ صرف دینی بلکہ سیاسی نقطۂ نظر سے بھی بالکل درست و ضروری تھا۔

اگر یہ صحیح ہے کہ امیر معاویہ کا دورِ امارت عہد نبوی و عہد فاروقی کے دورِ خلافت سے مختلف تھا۔ اگر یہ صحیح ہے کہ امویٰ عمّال عدل و انصاف سے ہٹ کر ظلم و تعدی کی طرف مائل ہوتے جا رہے تھے۔ اگر یہ صحیح ہے کہ اسلام

کی حقیقی روح اس دور میں مٹتی جا رہی تھی۔ تو پھر یہ بھی صحیح ہے کہ حضرت علی کا اس کے خلاف قدم اٹھانا ان کا دینی فریضہ تھا۔ اور جلد سے جلد اس کا استیصال ہونا چاہیئے تھا۔ کیونکہ حضرت علی جانتے تھے کہ جوں جوں زمانہ گزرتا جائے گا۔ اموی اقتدار کی جڑیں اور مضبوط ہوتی جائیں گی، اور اسلامی تعلیم سے لوگ اور زیادہ دور ہوتے جائیں گے۔ اس لئے حضرت علی پر یہ الزام قائم کرنا کہ انھوں نے اس باب میں عجلت سے کام لیا قطعاً نادرست ہے کیونکہ ان کی اسی عجلت پسند پالیسی کا نتیجہ تھا کہ صفین میں عساکر معاویہ کے قدم اکھڑ گئے اور اگر "رفع مصحف" کی چال کامیاب نہ ہوتی تو امیر معاویہ کی امارت ہمیشہ کے لئے ختم ہو گئی تھی۔

اس کے بعد بھی حضرت علی بدستور اپنے عزم پر قائم رہے۔ اور کون کہہ سکتا ہے کہ اگر ابن ملجم نے آپ کو شہید نہ کر دیا ہوتا تو آپ اپنے مقصد میں ناکام رہتے۔ آپ کو وقت ہی کتنا ملا۔ ذی الحجہ ۳۵ھ میں خلیفہ ہوئے اور رمضان ۴۰ھ میں شہید کر دیے گئے۔ پورے پانچ سال کا زمانہ بھی آپ کو نہ ملا۔ لیکن اس قدر مختصر مدت میں بھی آپ نے باوجود نامساعد حالات کے روایات اسلامی کو برقرار رکھنے کی جتنی کوشش کی وہ آپ اپنی نظیر ہے۔

اس میں شک نہیں مولانا عباسی نے اس کتاب کی تالیف میں بڑی کاوش سے کام لیا ہے۔ لیکن افسوس ہے کہ میں اسے تاریخی خدمت

نہیں کہہ سکتا۔ کیونکہ مورخ کا اولین فرض یہ ہے کہ وہ انتہائی دیانت سے کام لے کر رائے زنی کرے اور پہلے سے خود کوئی رائے قائم نہ کرے۔ لیکن اس کتاب کے لب و لہجہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ انھوں نے پہلے ہی یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ جا و بیجا امویین کی طرفداری کریں گے۔ اور اسی ارادے کو سامنے رکھ کر انھوں نے جو روایت جہاں مل گئی اور از روئے روایت اس کی تنقیح نہیں کی۔

ان کے استنادات کا انحصار زیادہ تر ابن کثیر (مصنف البدایہ والنہایۃ) ابن خلدون اور ابن تیمیہ پر ہے، حالانکہ ان میں سے ایک ابن خلدون اموی سلطنت (مغرب) کے وظیفہ خوار تھے اور باقی دو دمشق کے باشندے تھے جن کے خون میں بھی امویین کا نمک دوڑ رہا تھا۔ اس لئے عباسی صاحب کو انھیں تینوں کی روایات سے ہٹ کر اپنی تحقیق کی بنیاد قائم کرنا چاہیے تھی لیکن انھوں نے ایسا نہیں کیا کیونکہ دوسرے مورخین کی روایات عباسی صاحب کے مقصد کے خلاف پڑتی تھیں۔ اس لئے میں سمجھتا ہوں کہ عباسی صاحب کی یہ کتاب کوئی تاریخی وزن نہیں رکھتی بلکہ خالص اعتقادی تصنیف ہے جس کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ انھوں نے جہاں جہاں اپنے ممدوح (یزید) کا ذکر کیا ہے "رحمۃ اللہ علیہ" کا بھی اضافہ کر دیا ہے۔ حالانکہ اس کی کوئی ضرورت نہ تھی۔

پھر ہو سکتا ہے کہ عباسی صاحب یزید کی مداحی کو جزو ایمان سمجھتے ہوں، لیکن یہ کسی طرح مناسب نہ تھا کہ اس کا اظہار کر کے وہ نہ صرف شیعی

جماعت بلکہ اکثر سنی حضرات کا بھی دل دکھائیں اور اسلامی جماعت میں اور زیادہ تفریق پیدا کریں۔

یہ درست ہے کہ شیعی جماعت خلیفہ اوّل و دوم کو جائز و مستحق خلیفہ نہیں سمجھتی کیونکہ ان کے یہاں اصول خلافت کا تعلق شوریٰ یا انتخاب سے نہیں بلکہ وراثت دنسل آل رسول سے ہے۔ اور یہ بھی غلط نہیں کہ حضرت علی کو رسول اللہ کا اوّلین خلیفہ سمجھتے ہوئے دوسرے خلفا سے خوش نہیں ہیں۔ اور ہو سکتا ہے کہ بعض شیعی حضرات ان کے خلاف سب وشتم سے بھی کام لیتے ہوں لیکن اس کے معنی یہ نہیں کہ سنی جماعت کے کسی فرد کی طرف سے انتقام کی یہ صورت اختیار کی جائے کہ وہ یزید کی حمایت اور حسین کے خروج کی مخالفت کرنے لگے۔ اگر حضرات شیعہ کا خلفا کو برا کہنا کوئی معقول بات نہیں تو یزید کو اچھا کہنا بھی ویسی ہی نازیبا حرکت ہے۔

سنا گیا ہے کہ یہ کتاب پاکستان میں ممنوع الاشاعت قرار دیدی گئی ہے لیکن اس وقت تک اس کے دو ایڈیشنوں کی جتنی کاپیاں ملک میں پھیل گئی ہیں وہ بھی کم نہیں ہیں۔ اور ہو سکتا ہے کہ کسی وقت وہی فتنہ و فساد کا باعث بن جائیں

مطبوعات ادارۂ ادب العالیہ کراچی

انتقادیات مولانا نیاز فتحوری کے تیرہ تنقیدی مقالات کا مجموعہ جن کی نظیر نہیں ملتی۔ فہرست مضامین یہ ہے۔ اردو شاعری پر تاریخی تبصرہ۔ اُردو غزلگوئی کی عہد بہ عہد ترقی۔ نقشہائے رنگ رنگ (غالب کی فارسی گوئی پر تبصرہ) کلام مومن پر ایک طائرانہ نگاہ۔ ظفر کی شاعری۔ نظیر میری نظر میں۔ میاں نظام شاہ رامپوری۔ سیماب اکبرآبادی کا مجموعہ نظم۔ سید محمد میر سوز۔ نواب آصف الدولہ۔ یورپ کے ایک نوجوان ہندوستاعر فراق گورکھپوری۔ شیفتہ کی شاعری۔ ریاض کی یادیں۔ انتقادیات حصہ اول و دوم کے ان تمام مضامین کا انتخاب کیا گیا ہے۔ جس سے اہل ذوق اور طلبہ کو استفادہ میں آسانیاں پیدا ہو جائیں۔ اِن مضامین کا انتخاب نصابی نقطۂ نظر سے بھی بہت اہم ہے۔ اور اسی لئے یہ کتاب کالجوں کے نصاب میں بھی داخل کی گئی ہے۔

قیمت چار روپے پچاس پیسے

تاریخ کے گم شدہ اوراق حضرت نیاز کے ۲۴ افسانوں کا مجموعہ۔ جو تاریخ اور انشائے لطیف کے امتزاج کا بلند ترین معیار قائم کرتے ہیں۔ ان افسانوں کے مطالعہ سے واضح ہوگا کہ تاریخ کے بھولے ہوئے اوراق میں کتنی دلکش حقیقتیں پوشیدہ ہیں۔

جنھیں حضرت نیازؔ کی انشا نے اور زیادہ دلکش بنا دیا ہے۔

قیمت ۔ دو روپے پچاس پیسے

مذاہب عالم کا تقابلی مطالعہ | مولانا نیاز فتح پوری کی معرکتہ الآرا تصنیف جس میں مذاہب عالم کی ابتدا، مذہب کا فلسفہ وارتقا، مذہب کی حقیقت، مذہب کا مستقبل، مذہب سے بغاوت کے اسباب پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے اور مسیحیت کو علم و تاریخ کی روشنی میں پرکھا گیا ہے۔ قیمت ایک روپیہ ۷۵ پیسے۔

جذبات بھاشا | مولانا نیاز فتح پوری نے ایک دلچسپ اور عالمانہ تمہید کے ساتھ ہندی شاعری کے بہترین نمونے پیش کر کے ان کی تشریح ایسے تخلیقی انداز میں کی ہے کہ دل بیتاب ہو جاتا ہے۔ اُردو میں یہ پہلی کتاب ہے جو اس موضوع پر لکھی گئی اور جس میں ہندی کلام کے بے مثل نمونے نظر آتے ہیں۔ قیمت ایک روپیہ پچیس پیسے

نقاب اُٹھ جانے کے بعد | حضرت نیاز کے تین افسانوں کا مجموعہ جس میں بتایا گیا ہے کہ ہمارے ملک کے ہادیان طریقت اور علماء کرام کی زندگی کیا ہے۔ اور ان کا وجود ہماری معاشرت و اجتماعی حیات کے لئے کس درجہ سم قاتل ثابت ہوتا رہا ہے۔ زبان، پلاٹ اور انشا کے لحاظ سے جو مرتبہ ان افسانوں کا ہے وہ دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ قیمت ۔ بچھتر پیسے

ایک شاعر کا انجام | جناب نیاز فتح پوری کے عنفوان شباب کا لکھا ہوا طویل افسانہ جس کا ایک ایک

جملہ حسن و عشق کی تمام دلچسپ کیفیات سے معمور ہے۔ یہ افسانہ اپنے پلاٹ اور انشاء کے لحاظ سے اس قدر بلند چیز ہے کہ اس کی نظیر نہیں ملتی۔
قیمت ایک روپیہ پچیس پیسے

شبنمستان کا قطرۂ گوہرین | مولانا نیاز فتحپوری کے بہترین افسانوں کا مجموعہ جس میں حسنِ بیان۔ ندرتِ خیالات اور پاکیزگی کے بہترین شاہکار پیش کئے گئے ہیں۔ ہر افسانہ اپنی جگہ معجزہ ادب کی حیثیت رکھتا ہے۔ قیمت ایک روپیہ پچاس پیسے

ہندی شاعری نمبر | "نگار" کا سالنامہ جس میں ہندی شاعری کی مکمل تاریخ اور اس کے تمام ادوار کا بسیط تذکرہ موجود ہے۔ اس میں تمام مشہور ہندی شعراء کے کلام کا انتخاب ترجمہ کے ساتھ درج ہے۔ ہندی شاعری کی اصل قدر و قیمت معلوم کرنی ہو تو اردو میں آپ کے لئے صرف یہی ایک مجموعہ کافی ہے۔ قیمت تین روپے۔

نظیر نمبر | نظیر اکبرآبادی کی شخصیت اور کلام پر مدلل سیر حاصل مجموعہ۔ اس کے بعض عنوانات یہ ہیں:۔
نظیر کا مسلک۔ نظیر کی شاعری پر تبصرہ۔ نظیر اور عوام۔ نظیر کا انتخاب کلام مطبوعہ و غیر مطبوعہ۔ قیمت تین روپے۔

مصحفی نمبر | اردو غزل گوئی کا مسلم الثبوت استاد۔ اس کی شاعری پر مکمل اور مبسوط محققانہ اور بصیرانہ مضامین کا مجموعہ۔ اس کے بعض

عنوانات یہ ہیں:۔ حیاتِ مصحفی، اردو غزل گوئی میں مصحفی کا مرتبہ۔ مصحفی کی غیر مطبوعہ مثنویاں۔ انتخابِ کلام مطبوعہ و غیر مطبوعہ۔

قیمت تین روپے۔

نیاز نمبر جس میں تقریباً پاک و ہند کے سارے ممتاز اہلِ قلم اور اکابرِ ادب نے حصہ لیا ہے اس میں نیاز فتحپوری کی شخصیت اور فن کے ہر پہلو مثلاً ان کی افسانہ نگاری، تنقید، اسلوب نگارش، انشاپردازی، مکتوب نگاری، دینی رجحانات، صحافتی زندگی، شاعری و ادارتی زندگی۔ ان کے افکار و عقائد و دیگر بہت سے پہلوؤں پر سیر حاصل بحث کر کے ان کے علمی و ادبی مرتبے کا تعین کیا گیا ہے۔ گویا یہ نمبر حضرت نیاز کی شخصیت اور فن کا ایسا مرقع ہے جو اس سلسلے میں ایک مستند دستاویز اور صحافت میں گرانقدر اضافہ کی حیثیت رکھتا ہے۔

صفحات ۶۲۴ قیمت ...... آٹھ روپے

تذکروں کا تذکرہ نمبر ۱۹۶۴ء جس نے اردو زبان و ادب کی تاریخ میں پہلی بار انکشاف کیا ہے کہ ★ تذکرہ نگاری کا فن کیا ہے؟ ★ اس کی امتیازی روایات و خصوصیات کیا رہی ہیں؟ ★ تذکرہ نگاری کا رواج کب اور کن حالات میں ہوا؟ ★ اردو فارسی میں آج تک کتنے تذکرے لکھے گئے ہیں؟ ★ ان تذکروں اور ان کے مصنفین کی کیا نوعیت ہے؟ ★ ان میں کتنے اور کن کن شاعروں کا ذکر آیا ہے؟ ★ ان سے کسی خاص عہد کی ادبی و سماجی فضا کو سمجھنے میں کیا مدد ملتی ہے؟ ★ ان تذکروں میں اردو فارسی زبان و ادب کا کتنا بیش بہا خزانہ محفوظ ہے؟ ★ یہ خزانہ ادب کے تاریخی، تحقیقی، سوانحی اور تنقیدی شعبوں کیلئے کس درجہ مفید اور کتنا اہم ہے؟ ضخامت ۳۰۵ صفحات۔ قیمت چار روپے

مومن نمبر (مرتبہ:۔ نیاز فتحپوری) مومن اردو کا پہلا غزل گو شاعر ہے جو حکیم بھی ہے اور رند مشاہد باز بھی اس لئے اس کی شخصیت اور کلام دونوں میں ایک خاص قسم کی جاذبیت ہے یہ جاذبیت کس کس رنگ میں اور کس کس نوع سے اس کے کلام میں رونما ہوئی ہے اس میں اہلِ ذوق کیلئے لذتِ کام و دہن کا کیا کیا سامان موجود ہے اس کا صحیح اندازہ مومن نمبر کے مطالعہ سے ہوگا۔ اس نمبر میں مومن کی سوانح حیات، معاشقہ، اس کی غزل گوئی، قصیدہ نگاری، مثنویات و رباعیات اور خصوصیاتِ کلام کی قدر و قیمت کے متعلق اتنا وافر تنقیدی و تحقیقی مواد فراہم ہو گیا ہے کہ اس نمبر کو نظر انداز کر کے مومن پر اب نہ کوئی مقالہ یا کوئی تذکرہ مرتب کرنا مشکل ہے۔ قیمت چار روپے

ملنے کا پتہ:۔ **دفتر نگار پاکستان۔ ۳۳ گارڈن مارکیٹ۔ کراچی ۳**

من و یزداں

مولانا نیاز فتحپوری کی ۴۰ سالہ دور تصنیف و صحافت کا ایک غیر فانی کارنامہ۔ جس میں اسلام کے صحیح مفہوم کو پیش کر کے تمام نوع انسانی کو انسانیت کبریٰ اخوت عامہ کے ایک نئے رشتے سے وابستہ ہونے کی دعوت دی گئی ہے۔ جس میں مذہب کی تحقیق، دینی عقائد رسالت کے مفہوم اور صحافت مقدسہ کی تاریخ پر تاریخی و علمی اخلاقی اور نفسیاتی نقطۂ نظر سے نہایت بلیغ انشا اور پُر زور خطیبانہ انداز میں بحث کی گئی ہے۔ قیمت:- سات روپیہ پچاس پیسے

ناشر

ادارۂ۔ ادب العالیہ۔ کراچی ۱۲

درسِ انسانیت و اخوتِ عامہ کا پہلا اور آخری صحیفہ

من و یزداں

مذہبی تفریق کو ہمیشہ کے لئے ختم کر دینے والی

انجیلِ انسانیت

مولانا نیاز فتحپوری کی چوالیس سالہ دورِ تصنیف و صحافت کا غیر فانی کارنامہ، جس میں اسلام کے صحیح مفہوم کو پیش کر کے تمام نوعِ انسانی کو انسانیت کبریٰ اور اخوت عامہ کے ایک نئے رشتہ سے وابستہ ہونے کی دعوت دی گئی ہے اور مذاہب کی تخلیق و دینی عقائد و رسالت کے مفہوم اور کتب مقدسہ پر تاریخی و علمی، اخلاقی اور نفسیاتی نقطۂ نظر سے نہایت بلند انشاء اور پُر زور خطیبانہ انداز میں بحث کی گئی ہے۔ ——— قیمت ۷ روپے ۵۰ پیسے

ادارۂ نگار پاکستان۔ ۳۲ گارڈن مارکٹ کراچی ۳

مطبوعہ مشہور پریس، کراچی